ماھنامہ

حکمت بالغہ

جنوری2008

مدیر:انجینئر مختار حسین فاروقی

قرآن اکیڈمی

جھنگ پاکستان

فون اور فیکس:0092-47-7628361

ای میل:hikmatbaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ www.hamditabligh.net پر حکمت بالغہ کے تمام شمارے دستیاب ہیں

حرف آرزو

یہ اللہ ﷻ کا خاص کرم اور اس کی بے پایاں رحمت کا مظہر ہے کہ 'حکمت بالغہ' نے باقاعدہ اور مسلسل اشاعت کا ایک سال مکمل کرلیا ہے۔ گذشتہ دسمبر 06 میں جب حکمت بالغہ کا پہلا شمارہ زیر ترتیب تھا تو بے شمار خدشات اور خوف دامن گیر تھے کہ یہ پرچہ ہم باقاعدگی سے نکال بھی سکیں گے یا نہیں؟ پھر اس کو کوئی قابل ذکر پرچہ بنا سکیں گے یا نہیں؟ آج ایک سال بعد جب گذشتہ سال کے واقعات پر نگاہ بازگشت ڈالنے کا موقع مل رہا ہے تو صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ خالصتاً اللہ ﷻ کی رحمت بے پایاں اور اسکے لطف وکرم کا اعجاز ہے کہ 'حکمت بالغہ' نے کامیابی سے اپنا پہلا سال باقاعدہ اشاعت کے ساتھ مکمل کیا ہے اور مشمولات (CONTENTS) کے اعتبار سے بھی بہت اعلیٰ معیار کا نہ سہی ABOVE AVERAGE ضرور قرار دیا جاسکتا ہے۔

حکمت بالغہ کے دوسرے سال کا آغاز کرتے ہوئے جو امور پیش نظر ہیں وہ ہدیہ قارئین ہیں۔

قرآن اکیڈمی جھنگ گذشتہ 17 ماہ سے (یعنی مئی 06 سے آغاز کر کے) ماہانہ سیمیناروں کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ سیمینار اپنی جگہ بہت مفید رہے ہیں اور شرکاء کے علم اور آگہی میں اضافے اور شعور کی گہرائی کا باعث بنے ہیں۔ تاہم فی الحقیقت اس سے فائدہ اٹھانے والے لوگ بہت کم تھے۔ لہٰذا افادۂ عام کی غرض سے اور اشاعت خیر کی نیت سے ان سیمیناروں کی کاروائی کو مختصراً قلمبند کر کے حکمت بالغہ کے صفحات میں شائع کیا جائے گا۔ ہر ماہ ایک سیمینار کا خلاصہ

سامنے آئے گا۔ارادہ مکمل ہے باقی عملاً اس کا پورا کر دینا اللہ ﷻ کا کام ہے نیت یہ ہے کہ مارچ/ اپریل میں جیسے ہی یہ سلسلہ اختتام پذیر ہو ــــــــــــــ اس کے ساتھ ہی ان 20 شخصیات پر سیمیناروں کے سلسلہ کو حکمت بالغہ میں شائع کرنا شروع کر دیا جائے۔

سیمیناروں کے اس سلسلہ کا تعارفی دوورقہ تمام قارئین کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا اس لئے اسے دوبارہ شائع کیا جاتا ہے۔

مئی 06 میں پہلے سیمینار کے موقع پر تقسیم ہونے والے دوورقہ کی تحریر

حکمت بالغہ کا یہ جریدہ جیسا کہ اس کے سرورق پہ تحریر ہے 'جدید تعلیم یافتہ حضرات میں قرآن مجید کے علوم کے فروغ کا نقیب' ہے اور ایک مشن کے طور پر اس فریضہ کو سرانجام دے رہا ہے۔اس مشن میں کامیابی اور ناکامی کی پرواہ کئے بغیر تن من دھن سے مصروف عمل ہے۔

اس مشن کی تکمیل کے لئے قرآن اکیڈمی کے تحت کئی طرح کے پروگرام منعقد ہوتے رہتے ہیں۔قرآن فہمی کے لئے فری عربی کلاسیں، 25 روزہ تربیتی کورس، رمضان المبارک میں تراویح کے ساتھ مکمل ترجمۃ القرآن، شہر میں مختلف مقامات پر دروس قرآن کا سلسلہ اور خطاب جمعہ کے پروگرام شامل ہیں۔

''اسی سلسلہ کا ایک اہم پروگرام عربی کلاس کا اہتمام ہے جو 24 دسمبر 07 بروز سوموار سے مسجد عبیداللہ (المعروف گنبدوں والی مسجد جھنگ) میں جاری ہو چکا ہے جس میں حاضری بہت حوصلہ افزاء ہے قرآن اکیڈمی کے تحت عربی کورسز عربی کے 25 اسباق پر مشتمل ہوتے ہیں اور ہفتہ میں چار دن سوموار، منگل، بدھ اور جمعرات ہوتے ہیں اور بارہ ہفتے کا کورس ہے اس طرح یہ ابتدائی عربی کورس F.A یا B.A تعلیم والے حضرات کو قرآن فہمی کی طرف لے جانے کے لئے پہلا قدم بن جاتا ہے۔

فرمان خداوندی

(آیت 8 تا 11)

اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ

اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ

وَ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَکُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِیۡنَ فِیۡہِ ؕ

اور جس (مال) میں اس نے تم کو (اپنا) نائب بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ اَنۡفَقُوۡا لَہُمۡ اَجۡرٌ کَبِیۡرٌ

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور (مال) خرچ کرتے رہے ان کے لئے بڑا ثواب ہے

وَ مَا لَکُمۡ لَا تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ ۚ

اور تم کیسے لوگ ہو کہ اللہ پر ایمان نہیں لاتے۔

وَ الرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ لِتُؤۡمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ

حالانکہ (اسکے) پیغمبر تمہیں بلا رہے ہیں کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ

وَ قَدۡ اَخَذَ مِیۡثَاقَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ

اور اگر تم کو باور ہو تو وہ تم سے (اس کا) عہد بھی لے چکا ہے۔

ہُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبۡدِہٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ

وہی تو ہے جو اپنے بندے پر واضح (المطالب) آیتیں نازل کرتا ہے

لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط

تا کہ تم کو اندھیروں میں سے نکال کر روشنی میں لائے

وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

بیشک اللہ تم پر نہایت شفقت کرنے والا (اور) مہربان ہے

وَ مَالَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

اور تم کو کیا ہوا ہے کہ اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے

وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط

حالانکہ آسمانوں اور زمین کی وراثت اللہ ہی کی ہے

لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ط

جس شخص نے تم میں سے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور لڑائی کی وہ

(اور جس نے یہ کام پیچھے کئے وہ) برابر نہیں

اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ط

ان کا درجہ ان لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے جنہوں نے بعد میں خرچ (اموال)

اور (کفار سے) جہاد و قتال کیا

وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ط

اور اللہ نے سب سے (ثواب) نیک (کا) وعدہ تو کیا ہے

وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ

اور جو کام تم کرتے ہو اللہ ان سے واقف ہے

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً

کون ہے جو اللہ کو (نیت) نیک (اور خلوص سے) قرض دے

فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَ لَهٗ اَجْرٌ كَرِيْمٌ

تو وہ اس کو اس سے دگنا ادا کرے اور اس کے لئے عزت کا صلہ (یعنی جنت) ہے

قرآن مجید
کی
پانچ بنیادی اصطلاحات(3)
نور ہدایت حیات وممات ارادہ صلوٰۃ

انجینئر مختار حسین فاروقی

''حکمت بالغہ'' کے گزشتہ شماروں میں قرآن مجید کی پانچ بنیادی اصطلاحات پر قدرے تفصیلی بحث کا آغاز کیا گیا تھا جس میں لفظ''نور'' اور''ہدایت'' پر گفتگو ہو چکی ہے اب اس شمارے میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے لفظ''حیات ممات'' پر خیالات کو یکجا کیا گیا ہے۔ تا کہ قارئین کے ذہن میں قرآن مجید کے حوالے سے ان اصطلاحات کا ایک جامع تصور (CONCEPT) جاگزیں ہو جائے جو ہر موقع پر انسان کو صحیح رہنمائی دے سکے اور آئندہ دوران مطالعہ سامنے آنے والے مختلف زاویہ ہائے فکر کو ان کے صحیح پس منظر میں صحیح جگہ پر رکھا جا سکے اور ان کو اتنی ہی اہمیت دی اور اسی طرح سے فوقیت دی جائے۔ جس اہمیت اور فوقیت کے وہ اس تناظر میں مستحق قرار پاتے ہیں۔ بلاوجہ کسی خیال کو نہ سنتے ہی رد کر دینا چاہئے۔ اور نہ ہی کسی بات کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لینا چاہئے۔ (ادارہ)

بسم الله الرحمٰن الرحیم

1۔ حیات وممات قرآن مجید کی دو بہت ہی بنیادی اصطلاحات ہیں یہ قرآن مجید، کلام الٰہی ہے اور ہمارے لئے زندگی کی کٹھن اور دشوار منزلوں سے کمال آسانی اور اطمینان سے گزرنے اور کامیاب ہونے کا دعویٰ رکھتا ہے اللہ ﷻ نے انسانوں کو پیدا فرمایا ہے اور اشرف المخلوقات قرار دیا ہے یہ شرف انسانی کئی طرح سے آشکارا ہوتا ہے جس میں غالباً شعورِ ذات' سب سے اہم ہے اسی شعورِ ذات ہی کا کرشمہ ہے کہ ہمیں زندگی کا احساس ہے اور موت کا بھی حتیٰ کہ اللہ ﷻ نے ہمیں پیدائش سے پہلے اور موت کے بعد کی کیفیات سمجھانے کے لئے قرآن مجید میں حیات وممات کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں اور اس کے ایک سے زائد معانی بیان فرمائے ہیں نیز حقیقت ومجاز کا رنگ دے کر گمراہی کی دلفریبیوں کی جگہ ہر رنگ عظمت انسانی کا علم بلند کر دیا ہے

2۔ اس کلام الٰہی میں انسان کو عقل سے کام لینے اور غور وفکر کرنے پر آمادہ کرنے کیلئے مختلف انداز سے توجہ دلائی گئی ہے مثلاً قرآن مجید میں اللہ ﷻ نے سورۃ ملک (67-2) میں

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَ ھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ۔

ترجمہ: ''اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے اور وہ زبردست (اور) بخشنے والا ہے''۔

فرما کر انسان کو ورطہِ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ حیات سے پہلے موت سے مراد کیا ہو سکتی ہے؟ ابھی اس سوال پر غور کرتے ہوئے سورۃ مومن (40-11) کی اس آیت پر نگاہ دوڑائیں اللہ ﷻ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن کافر لوگ کہیں گے۔

قَالُوا رَبَّنَا اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَاَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَھَلْ اِلٰی خُرُوْجٍ مِنْ سَبِیْلٍ۔

ترجمہ: ''وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار! تو نے ہم کو دو دفعہ بے جان کیا اور دو دفعہ جان بخشی۔ ہم کو اپنے گناہوں کا اقرار ہے تو کیا نکلنے کا کوئی راستہ

ہے؟''

اس آیت کے مطابق دو'موتوں' اور دو'حیاتوں' سے انسان گزرنے والا ہے۔ یہاں دو(موتوں) سے مراد دو الگ الگ انسانوں کی موت کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایک ہی انسان کی بڑی طویل حیات کے تسلسل میں دو موتیں واقع ہوں گی ایک تیسری قسم کی موت کا ذکر احادیث مبارکہ میں وارد ہے چنانچہ تلقین فرمائی رسول اللہ ﷺ نے کہ ہر مسلمان رات کو سوتے وقت یہ دعا پڑھ کر سوئے۔ حیرت ہے اس دعا میں 'موت' کی نسبت انسان کی اپنی ذات کی طرف ہے جبکہ اوپر درج شدہ دو آیات میں یہ نسبت اللہ ﷻ نے اپنی طرف فرمائی ہے۔

اَللّٰھُمَّ بِاسْمِكَ اَمُوْتُ وَ اَحْیَا

ترجمہ: ''اے اللہ تیرے نام سے ہی میں مرتا ہوں اور جیتا ہوں''۔

جبکہ سو کر اٹھتے وقت کی دعا کے الفاظ اس کے برعکس ہیں!

اَلْحَمْدُ للّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانِیْ بَعْدَ مَا اَمَاتَنِیْ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ۔

ترجمہ: تمام تعریف اور شکر اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے مارنے کے بعد زندہ کر دیا اور اسی کی طرف مر کر جانا ہے''

3۔ یہاں تک کی گفتگو میں (2+1) یعنی تین قسم کی اموات کا ذکر ہے۔ یہ تین قسم کی 'موت' یقیناً اپنی نوعیت کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ کیفیات کی حامل ہیں ورنہ ایک سے زیادہ 'قسم' کا ذکر کلام اللہ میں نہ ہوتا۔

اسی طرح 'موت' کی مختلف نوعیّتوں کے ہم پلہ 'حیات' کی بھی کئی کیفیات اور شانیں لازمی اور لابدی ہیں۔ یعنی ایک بڑی طویل زندگی جس کے دوران دو اہم 'موتیں' اور تین چھوٹی زندگیاں ہیں۔

4۔ قرآن مجید میں مذکور دو 'موتیں' اپنے درمیان ایک حیات کی متقاضی ہیں اور پہلی موت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس سے پہلے 'حیات' کا ہونا لازمی ہے ورنہ موت چہ معنی دارد اسی حقیقت کی طرف اشارہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے سورۃ بقرہ (2-28)۔

كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ

ثُمَّ يُحۡيِيكُمۡ ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ۔

ترجمہ: ''تم اللہ سے کیوں کر منکر ہو سکتے ہو اس حال میں کہ تم بے جان تھے تو اس نے تم کو جان بخشی، پھر وہی تم کو مارتا ہے، پھر وہی تم کو زندہ کرے گا، پھر تم اس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے''۔

5۔ اوپر درج آیت میں ' کنتم امواتا ' کے الفاظ صریحاً اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف آدم علیہ السلام جو پہلے انسان ہیں وہی نہیں بلکہ تم سب انسان ایک خاص اور پروقار کیفیت میں زندہ تھے پھر تمہیں 'موت' دے دی گئی پھر تمہیں زندہ کر دیا گیا پھر اللہ ﷻ تمہیں موت دے گا اور (روز قیامت) دوبارہ زندہ کر دے گا اور تمہیں اللہ ﷻ کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔

اس آیت میں پہلی موت سے پہلے ایک 'حیات' کا ہونا ثابت ہے اور دوسری موت کے بعد امت مسلمہ کے بنیادی عقائد کے مطابق 'حیات بعد الممات' کا جو تصور ہے اس کا ذکر ہے یعنی قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ دوسری موت پر زندگی کا اختتام نہیں ہے بلکہ اللہ ﷻ انسانوں کو دوبارہ زندگی بخشے گا اور پھر تمام انسانوں کا حساب کتاب ہوگا اور اس کے نتیجے میں جنت اور دوزخ کے فیصلے ہوں گے۔ جنت کی یہ زندگی نہ ختم ہونے والی زندگی ہوگی جس کے لئے ابداً ابداً کے الفاظ ہی بولے جا سکے ہیں اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی لفظ موجود نہیں ہے ــــــــــــــ یعنی انسانی زندگی ایک بہت طویل سفر ہے اللہ ﷻ نے انسانوں کو حیات بخشی پھر موت دے دی پھر اس دنیا میں زندہ کر دیا، پھر موت دے دے گا اور پھر قیامت کے دن زندہ کر دے گا اور پھر کبھی موت نہیں آئے گی۔

گویا اب تک کی گفتگو میں انسانی حیات کے تین وقفے ہیں اور ہر دو 'حیات' کے درمیان ایک 'موت' حائل ہے۔

6۔ قرآن مجید ہمیں 'عہد الست' سورۃ اعراف (172-173) یاد دلاتا ہے جو ہماری حیات اوّل کا ایک ہی قابل ذکر واقعہ قرآن و حدیث میں آیا ہے اور یہ ہم پر پہلی موت کے وارد ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے اسی طرح قرآن مجید ہمیں حیات بعد الممات کا تصور دیتا ہے اور یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ اس کی تفصیلات میں بہت سے مراحل سے قرآن مجید ڈراتا ہے اور کئی مراحل

پرخوش کن صورت حال کی خوش خبری سناتا ہے جیسے اللہ ﷻ کے سامنے پیشی، پانچ سوالوں کے جوابات، نامہ اعمال کا دائیں یا بائیں طرف سے دیا جانا یا عرش کے سایہ میں رونق افروز، خوش نصیب اہل ایمان یا حوض کوثر پر اہل ایمان کی سیر آبی اور کچھ بدنصیبوں کی محرومی وغیرہ وغیرہ۔

یہ ساری تفصیلات اس بات کی متقاضی ہیں کہ بظاہر ایک موت کا وارد ہونا اور پھر دوبارہ زندہ کر دیا جانا ہمارے حافظہ یادداشت اور احساسات کو ختم نہیں کرے گا بلکہ حافظہ (MEMORY) کا ایک تسلسل ہے جو موت اور برزخ کے مراحل سے گزرنے کے باوجود ہمیں حاصل رہے گا۔ مثلاً قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

یَوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّ مَتْ یَدَاهُ وَ یَقُوْلُ الْکَافِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا۔(النباء40)

ترجمہ: ''جس دن ہر شخص ان اعمال کو جو اس نے آگے بھیجے ہونگے دیکھ لے گا اور کافر کہے گا کہ اے کاش! میں مٹی ہوتا''

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَہٗ بِیَمِیْنِہٖ فَیَقُوْلُ ھَآؤُ مُ اقْرَءُ وْا کِتٰبِیَہْ o اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَہْ o فَھُوَ فِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ o فِیْ جَنَّۃٍ عَالِیَۃٍ o قُطُوْفُھَا دَانِیَۃٌ o کُلُوْا وَاشْرَبُوْا ھَنِیْئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَۃِ o وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبِہٖ بِشِمَالِہٖ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ کِتٰبِیَہْ o وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَہْ o یٰلَیْتَھَا کَانَتِ الْقَاضِیَۃَ o مَا اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَہْ o ھَلَکَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَہْ o (الحاقۃ19-29)

ترجمہ: '' تو جس کا (اعمال) نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ (دوسروں سے) کہے گا کہ لیجئے میرا نامہ اعمال پڑھئے مجھے یقین تھا کہ مجھ کو میرا حساب (کتاب) ضرور ملے گا پس وہ (شخص) من مانے عیش میں ہوگا۔ (یعنی) اونچے (اونچے محلوں کے) باغ میں۔ جن کے میوے جھکے ہوئے ہونگے جو (عمل) تم ایام گزشتہ میں آگے بھیج چکے ہو اس کے صلے میں مزے سے کھاؤ اور پیو۔ اور جس کا نامہ (اعمال) اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا اے کاش مجھ کو

میرا (اعمال) نامہ نہ دیا جاتا۔ اور مجھے معلوم نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ اے کاش موت (ابدالآباد کیلئے میرا کام) تمام کر چکی ہوتی۔ (آج) میرا مال میرے کچھ بھی کام نہ آیا (ہائے) میری سلطنت خاک میں مل گئی''۔

گویا انسان کو قیامت کے دن اپنی اس دنیا کی موجودہ زندگی کے اعمال، عیش آرام اور دیگر کیفیات کا پورا ادراک اور شعور ہوگا۔

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَاo

(النازعات46)

ترجمہ: ''جب وہ اس کو دیکھیں گے (تو ایسا خیال کریں گے) کہ گویا (دنیا میں صرف) ایک شام یا صبح رہے تھے''

یعنی انسان کو اپنی اس دنیا کی زندگی کی ساری کیفیات ایک دن یا اس کے ایک حصے کے برابر نظر آئیں گی۔

7۔ نتیجۃً ــــــــــــــ 'موت' کے لفظ کے قانونی، فقہی، عدالتی اور عام انسانی سطح پر کچھ بھی معنی ہوں اور ہمارے عام تصورات میں چاہے کتنا طویل عرصہ لگے کہ ہمارے دادا، نانا کو دنیا سے گئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ اور ان کی جائیدادیں تقسیم ہو گئیں۔ ان کی اولادیں یتیم کہلائیں ان کی عورتیں بیوہ ہوئیں اور بعض حالات میں نکاح ثانی کر لئے یا عورت کی موت کے بعد مرد نے اس کی بہن سے شادی کر لی جو زندگی میں جائز نہ تھی تاہم یہ حقیقت ہے ہر فوت ہونے والا اس دنیا سے پہلے کی زندگی اور ــــــــــــــ اس زندگی کا بھی شعور موت کے بعد دوبارہ ملنے والی زندگی میں رکھے گا۔ اور اب بھی وہ شاید مکمل طور پر بے حس اور بے خبر نہیں ہے (واضح رہے کہ علم النفس میں شعور کے ساتھ 'تحت الشعور' اور 'لاشعور' کی اصطلاحات بھی مستعمل ہیں) البتہ ہم اس دنیا کے ضابطوں میں جکڑے ہوئے انسان موت کی دہلیز کے بعد کی زندگی کا شعور نہیں کر سکتے چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (البقرۃ-154)

ترجمہ ''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں ان کی نسبت یہ نہ کہنا کہ وہ مرے ہوئے ہیں (وہ مردہ نہیں) بلکہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے۔''

یہی مضمون سورۃ آل عمران کی آیات 171-169 میں وارد ہوا ہے ـــــــــــــــ اگرچہ شہید ہونے والے شخص کی جائیداد اور بیوی بچے فقہی اور شرعی احکام کے تحت فوت ہونے والے کے بعد مختلف زندگی گزارتے ہیں مگر قرآن شہید کو زندہ فرماتا ہے اور ساتھ ہی یہ تصریح بھی ہے کہ تم ان کی 'حیات' کی کیفیت کا شعور نہیں رکھتے۔

اسی طرح پھر شہداء سے اوپر والے درجے میں انبیاءِ اکرام علیہم السلام و صدیقین با صفا اور کم درجے میں اولیاء کرام اور صلحائے امت موت کے وارد ہونے کے باوجود ایسی کیفیات میں رہتے ہیں جو ان کے اپنے درجے کے مطابق رب العزت عطا فرماتے ہیں واللہ اعلم۔

8۔ قرآن مجید کی تعلیمات اور احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشنی میں جو تصورات بنتے ہیں پھر یہ تصورات جب ہمارے عوام اور بالخصوص شعراء تک آتے ہیں اور ہماری شاعری اور ادب میں جگہ پاتے ہیں جنہیں ہر شاعر اور ادیب تو نہیں مگر محتاط اور اہل علم حضرات نہایت احتیاط سے جچے تلے الفاظ میں ادا کر کے ابلاغ کا حق ادا کرتے ہیں ہماری زندگی 'عہد الست' سے پہلے سے لے کر اور جنت میں داخلے کے بعد کی ہمیشہ کی زندگی تک پھیلی ہوئی ہے۔

بقول شاعر

ـــــ تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

یا عہد الست جو روحوں کے ایک اجتماع کی شکل میں تھا اس کا نقشہ ایک شاعر نے پنجابی میں یوں کھینچا ہے

ع پہلا میلہ اللہ لایا تے کن فیکون جدوں فرمایا

9۔ اس ساری تفصیل کے باوجود 'حیات' کے تین مراحل میں سے سب سے اہم مرحلہ یہ حیات دنیوی ہے جس میں سے ہم گزر رہے ہیں۔

ہر مرحلہ حیات اگرچہ دنیاوی تقویم اور کائناتی تناظر میں نہایت ہی مختصر ہے مگر یہ حیات

دنیوی کا مرحلہ تو 'کل حیات' کے مقابلے میں نہایت مختصر اور اقل القلیل ہے۔ ایک اندازے کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک بمشکل 9 یا 10 ہزار سال بنتے ہیں جبکہ کائنات کی تخلیق کے مراحل کروڑ ہا سال پر پھیلے ہوئے ہیں یہ زندگی مختصر سہی مگر خالق کائنات کی نگاہ میں انسان کے لحاظ سے سب سے اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے دارالعمل بنا دیا ہے اور 'لیبلو کم ایکم احسن عملا' ''دیکھیں تم میں سے کون عمل کے اعتبار سے اچھا ہے'' فرما کر آگے کے مراحل کے لئے فیصلہ کن بنا دیا ہے اسی دنیا میں عمل کے مواقع ہیں اور اچھا یا برا عمل کر کے انسان آئندہ حیات میں جنت یا دوزخ کا مستحق قرار پاتا ہے۔

اس زندگی کے بارے میں اہم نکات درج ذیل ہیں

ا۔ اس مرحلہ حیات دنیوی کی اہمیت کے پہلو سے ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرما کر دنیا میں بھیجا ہے۔ روح کو جسم کے ساتھ جوڑ کر بعض بڑی حقیقتیں اس انسان کے ظاہری حواس سے مخفی کر دی ہیں تاہم روح بیدار ہو تو تعقل اور REASONING کے بعد وجدان اور چھٹی ساتویں یا آٹھویں حس (SENSE) بھی بیدار کر کے وہاں تک پہنچا جا سکتا ہے۔

ب۔ اللہ تعالیٰ انسان کو ظاہری حواس کے ساتھ علم الاشیاء عطا فرماتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا (بقرة-31)

''اور اس (اللہ تعالیٰ) نے آدم (علیہ السلام) کو ہر شے کے اسماء کی تعلیم فرمائی۔''

اور ضمیر ______ عقل ______ فؤاد عطا فرمایا تا کہ انسان اپنے مشاہدات و تجربات سے نتائج اخذ کر سکے۔

ج۔ اس پر مزید انسان کی ہدایت کے لئے فرشتوں کی تائید اور تثبیت قلبی کا سامان پیدا کر دیا جیسا کہ فرمایا!

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ

اَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (حم السجدہ-31)

ترجمہ: ''جن لوگوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ (اس پر) قائم رہے ان پر فرشتے اتریں گے (اور کہیں گے) کہ نہ خوف کرو اور نہ غم ناک ہو اور بہشت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے خوشی مناؤ۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست تھے اور آخرت میں بھی (تمہارے رفیق ہیں) اور وہاں جس (نعمت) کو تمہارا جی چاہے گا تم کو ملے گی اور جو چیز طلب کرو گے تمہارے لئے موجود ہوگی۔''

د۔ ہدایت کی ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر اللہ ﷻ نے اس کے کئی اسباب مہیا فرما دیئے جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ اپنے برگزیدہ بندوں کو چن کر نبی اور رسول بنایا اور ان پر اپنا کلام اتارا وحی اور ہدایت بھیجی اور کئی انبیاء کرام علیہم السلام کو تحریری ہدایات بھیجیں اور بالآخر جب انسان نے کتابیں بنانا سیکھ لیں تو تورات، زبور، انجیل اور قرآن جیسی کتابیں عطا فرمائیں اس لئے کہ زبانی ہدایت کے مقابلے میں تحریر زیادہ اور موثر ذریعہ ہدایت ہے۔

ان چار آسمانی کتابوں میں سے قرآن مجید آخری کتاب بھی ہے اور ان سب کتابوں کے مضامین (CONTENTS) کا نگہبان (مہیمن) ہے۔ اور قیامت تک کے لئے محفوظ بھی جیسا کہ خود قرآن مجید میں اعلان ہے

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر-9)

ترجمہ: ''بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہمیں نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں''۔

ہ۔ انبیائے کرام علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے اور تمام انسانوں کے ساتھ زندگی گزاری مگر ان کی زندگی ہر قسم کی آلائشوں سے پاک اور انسانی غلطیوں، خطاؤں اور غفلتوں سے مبرا تھی۔ بلکہ ایسی پاکیزہ زندگی کہ تمام انسانوں کیلئے مثالی نمونہ تھی اسی طرز زندگی کو 'شاہد' اور حقیقی 'شہید' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا یہ پاکیزہ سیرت لوگ تھے۔

انسانوں کوان کے اصل مقام ومرتبہ اور آخرت کی یاد دہانی کے لئے تشریف لائے تھے اورانہوں نے اللہ ﷻ کے پیغامات لوگوں تک پہنچائے اور 'پیغمبری' کا حق ادا کر کے دنیا سے تشریف لے گئے یہی گواہی انہوں نے دنیا میں دی اور اسی کا ایک پرتو آخرت میں حساب اخروی کے مرحلہ پر ہوگا۔

و۔ انسانی زندگی انفرادی اور اجتماعی گوشوں میں منقسم ہے۔ان حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی دونوں میں لوگوں کیلئے رہنمائی بخشی اور آسمانی ہدایت کے ذریعے صراط مستقیم اور 'عدل و انصاف' کی شاہراہ پر انسانیت کو گامزن کر دیا کہ لوگ انصاف اور عدل کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

ان حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے صرف وعظ نہیں فرمایا اور صرف تبلیغ اور زبانی نصیحت پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ عملی زندگی میں اگلے مراحل از قسم اقدام اور جنگ جیسی صورت حال میں بھی لوگوں کو اللہ ﷻ کی پسندیدہ راہ اور ہدایت کے نمونے دیئے تا کہ لوگ اس کے مطابق زندگی گزار سکیں اور ظلم کے مرتکب نہ ہوں چنانچہ فرمایا!

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ (الحدید.25)

ترجمہ: ''ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان پر کتابیں نازل کیں اور ترازو (یعنی قواعد عدل) تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور لوہا پیدا کیا۔ اس میں (اسلحۂ جنگ کے لحاظ سے) خطرہ بھی شدید ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں اور اس لئے کہ جو لوگ بن دیکھے اللہ اور اس کے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں اللہ ان کو معلوم کرے بیشک اللہ قوی (اور) غالب ہے۔''

ز۔ اس سلسلہ نبوت ورسالت کو اللہ ﷻ نے کامل ترین نبی اور اکمل ترین رسول حضرت محمد ﷺ کے آنے کے بعد موقوف فرمایا کہ انسان کو ہدایت کے لئے حضرت محمد ﷺ کے اسوہ حسنہ کے بعد کسی اسوہ کی ضرورت نہیں اور آپ پر اتاری گئی کتاب

’قرآن مجید‘ کے بعد کسی آسمانی ہدایت کی ضرورت نہیں پھر اللہ ﷻ اس آخری پیغام

نوع انسانی را پیام آخرین ؎

حامل او رحمۃ للعالمین اقبالؔ

کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا اور اس کے اسباب پیدا فرما دیئے۔ تورات زبور اور انجیل کے برعکس قرآن مجید آج بھی اپنی اصلی زبان اور متن کے ساتھ محفوظ ہے۔

ح۔ اس آسمانی ہدایت کے مطابق انسان کو زندگی گذارنا ہے جو انسان اس حیات دنیوی میں اللہ ﷻ کے بتائے ہوئے راستے اور اس کی بتائی ہوئی ہدایت اور حلال وحرام کے ضابطوں کی پابندی کرے گا وہ اس دنیا میں بھی سرخرو رہے گا اور مرنے کے بعد آخرت میں بھی سرخرو ہو کر دوزخ سے بچا لیا جائے گا اور جنت میں داخل کر دیا جائے گا جبکہ ــــــــــــ اس کے برعکس جو انسان اس دنیا میں اپنے رب کی نافرمانی کرے گا انبیاء کرام علیہم السلام کی لائی ہوئی ہدایت اور ان کے اسوہ حسنہ کے خلاف چلے گا وہ اس دنیا میں بھی پریشانی کی زندگی گزارے گا اور مرنے کے بعد آخرت میں جہنم کے حوالے کر دیا جائے گا چنانچہ فرمایا!

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (بقرۃ-38)

ترجمہ: ’’جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو (اس کی پیروی کرنا کہ) جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہوگا۔ نہ وہ غمناک ہوں گے۔‘‘

اور

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا وَنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (طٰہٰ-124)

ترجمہ: ’’اور جو میری نصیحت سے منہ پھیرے گا اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی اور قیامت کو ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔‘‘

ط۔ اس دنیا میں انسان اپنی حیات مستعار (عارضی زندگی) گزار رہا ہے اور اس کو اپنے ماسبق حالات اور 'موت' کے بعد کے مراحل کا عمومی شعور نہیں ہے اور نہ ہی انسان ان چیزوں کو مجرد اپنی عقل سے ڈھونڈ سکتا ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو عقل و شعور کی اعلیٰ صلاحیتوں سے بہرہ ور ہیں اور کائنات اور اپنی تخلیق پر غور کرتے ہیں۔ ضمیر کے مطابق زندگی گذارتے ہیں اور ظلم و ناانصافی اور بے حیائی سے اجتناب کرتے ہیں جنہیں اس کا قدرے شعور ہو جاتا ہے وہ اپنے رب کو پہچانتے ہیں اور 'اسی' کا ہر وقت 'ذکر و تذکرہ' کرتے ہیں اور آخرت کے حساب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا!

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ (ال عمران 190)

ترجمہ: ''بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔''

یہ خوش نصیب لوگ انسانیت کا حاصل اور حقیقی معنی میں فخر انسانیت (CREAM OF SOCIETY) ہیں اور انسانیت کی معراج پر ہیں۔ ایسے لوگوں کے سامنے جب آسمانی ہدایت آتی ہے تو وہ انہیں اپنے دل کی آواز محسوس ہوتی ہے لہٰذا اسے آگے بڑھ کر قبول کر لیتے ہیں

رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیۡ لِلۡاِیۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ فَاٰمَنَّا رَبَّنَافَاغۡفِرۡلَنَا ذُنُوۡبَنَا وَکَفِّرۡ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ o رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَاوَعَدۡتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخۡزِنَا یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ اِنَّکَ لَاتُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَo۔ (ال عمران 193-194)

ترجمہ: ''اے پروردگار ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا کہ ایمان کیلئے پکار رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لے آئے اے پروردگار ہمارے گناہ معاف فرما، اور ہماری برائیوں کو ہم سے محو کر اور ہم کو دنیا سے نیک بندوں کے ساتھ اٹھا اے پروردگار تو نے جن جن چیزوں کے ہم سے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے وعدے کئے ہیں وہ ہمیں عطا فرما اور قیامت

کے دن ہمیں رسوانہ کیجیو، کچھ شک نہیں کہ تو خلافِ وعدہ نہیں کرتا''

ی یہ ہے اس مختصر دنیوی زندگی کی اہمیت کہ یہ اگلے تمام مراحل کے لئے ایک موڑ اور فیصلہ کن وقت ہے چنانچہ فرمان نبوی ﷺ ہے۔

اَلدُّنیَا مَزرَعَۃُ الاٰخِرَۃِ ۔(فردوس دیلمی)

ترجمہ: ''دنیا آخرت کے لئے (بمنزلہ) کھیتی ہے''۔

لفظ حیات اور اس کے استعمالات

لفظ 'حیات' قرآن مجید میں کئی معنی میں استعمال ہوا ہے۔اس کے لفظی معنی زندگی کے ہیں۔اس مادہ ح۔ی۔ی سے کئی دیگر الفاظ اور مشتقات بھی قرآن مجید میں آئے ہیں۔ان سب استعمالات میں 'زندگی' کے معنی ہی مشترک ہیں البتہ جیسے زندگی اور (LIFE) کوئی ایک درجہ اور مرحلہ کی چیز نہیں ہے اس کے بے شمار مراحل اور انواع و اقسام ہیں جیسا کہ علم نباتات اور علم حیوانات کے ماہرین خوب جانتے ہیں۔

قرآن مجید کے درج ذیل استعمالات سے اس کثیر الجہتی حقیقت کی طرف چند اشارے ملتے ہیں۔

قَالَ اَلقِھَا یٰمُوسٰی فَاَلقٰھَا فَاِذَا ھِیَ حَیَّۃٌ تَسعٰی ۔(طٰہٰ20-21)

ترجمہ:۔''فرمایا کہ اے موسیٰ اس (لاٹھی) کو ڈال دو تو انہوں نے ڈال دیا اور وہ ناگہاں سانپ بن کر دوڑنے لگا''۔

حَیَّۃ ــــــــــــ اژدہا۔یہ حیات کی ابتدائی شکل ہے جس سے رینگنے والی اور حرکت کرنے والی مخلوق مراد ہے۔

لفظ حیاۃ ایک دوسرے معنے میں استعمال ہوا ہے فرمایا!

وَاِذَا حُیِّیتُم بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوا بِاَحسَنَ مِنھَا اَو رُدُّوھَا اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیءٍ حَسِیبًا (النساء-86)

ترجمہ:''اور جب تم کو کوئی دعا دے تو (جواب میں) تم اس سے بہتر (کلمے سے اسے) دعا دو یا انہیں لفظوں سے دعا دو بے شک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔''

یہاں لفظ حیات سے مراد ہے کہ دو انسان قریب سے گذریں تو اک دوسرے کو سلام یعنی احساس زندگی دلائیں اور دوسرا اس کا جواب (سلام) دے اور شعوری طور پر ایسا ہو کہ وہ اس سے بہتر سلام لوٹائے یا کم از کم ویسا ہی۔ سلام کے جواب میں سلام کہنا گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ آدمی اخلاقی طور پر زندہ ہے۔ گویا ردعمل (RESPONSE) مراد ہے جو زندگی کا لازمی حصہ ہے۔

اسی طرح 'حیات' کے مصدر سے چلتی پھرتی دیکھتی سنتی مخلوق کے لئے 'مبالغہ' کا صیغہ حیوان بولا جاتا ہے یعنی حیوانات مخلوقات کا وہ درجہ ہے جو 'حیات' کے اعتبار سے مکمل اور تکمیلی شان کا حامل ہے۔

اس رخ پر استدلال کا آخری درجہ اللہ ﷻ نے یوں ذکر فرمایا ہے کہ یہ جسمانی حیات بھی اس دنیاوی زندگی میں بہت محدود اور جکڑی ہوتی ہے جبکہ آخرۃ میں جہاں اور بہت زیادہ فرق ہیں وہاں جسمانی اور بدنی 'حیات' بھی اپنے کمال اور اکملیت کے درجے پر ہوگی چنانچہ ارشاد ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةِ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (العنکبوت۔64)

ترجمہ:۔''اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشا ہے اور بے شک آخرت کا گھر ہی اصل 'زندگی' ہے کاش یہ لوگ سمجھتے''۔

شعور ـــــــــــــ حیات

غفلت ـــــــــــــ موت

حیات و ممات کے الفاظ قرآن مجید میں حقیقت کے بجائے 'مجاز' کے لئے زیادہ استعمال ہوئے ہیں اور اس طرح بڑے حکیمانہ انداز میں زندگی اور موت کے کئی پہلو اجاگر ہو گئے ہیں جن کے لئے ہمارے ہاں دوسرے الفاظ مستعمل ہیں تاہم حقیقی مفہوم تک رسائی کے لئے یہ مثالیں ناگزیر ہیں۔

مثال نمبر 1۔ارشاد باری تعالی ہے!

اَ وَمَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ (الانعام۔122)

ترجمہ: ''بھلا جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لئے روشنی کردی جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے کہیں اس شخص جیسا ہوسکتا ہے جو اندھیرے میں پڑا ہوا ہو۔اور اس سے نکل ہی نہ سکے اسی طرح کافر جو عمل کررہے ہیں وہ انہیں اچھے معلوم ہوتے ہیں''۔

اس آیت مبارکہ میں موت سے مراد بے توجہی ہے اور حیات سے مراد انسان کا جاگ جانا اور کسی اہم بات پر پہلے غور نہ کرنے اور عدم توجہ پر حیرت کا احساس ہونا ہے۔

عربی کا شعر ہے۔ ؎

وَقَدۡ نَادَيۡتَ لَوۡاَسۡمَعۡتَ حَيّاً وَلٰكِنۡ لَا حَيَاةَ لِمَنۡ تُنَادِى

ترجمہ: ''اگر تم کسی زندہ شخص کو سناتے تو تمہارا پکارنا (مفید) ہوتا لیکن تم جسے اس میں کوئی زندگی ہی نہیں ہے۔''

مثال نمبر 2 ۔مردہ زمین اور زندہ زمین

ارشاد باری تعالی ہے!

وَالنَّخۡلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلۡعٌ نَّضِيۡدٌ ۙ رِّزۡقًا لِّلۡعِبَادِ وَاَحۡيَيۡنَا بِهٖ بَلۡدَةً مَّيۡتًا ؕ كَذٰلِكَ الۡخُرُوۡجُ۔(ق 10۔11)

ترجمہ: ''اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابھا تہ بتہ ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ بندوں کو روزی دینے کیلئے (کیا ہے) اور اس (پانی) سے ہم نے شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ) کو زندہ کیا (بس) اسی طرح (قیامت کے روز) نکل پڑنا ہے''۔

یہاں بنجر زمین اور بے آب وگیاہ علاقے کو 'مردہ' کہا گیا اور بارش کے بعد اس میں سبزہ پیدا ہونے اور ہرے بھرے ہونے کو 'زندہ' قرار دیا گیا ہے اور اسی مثال سے قیامت کے دن

مردوں کو زندہ کرنے کا طریقہ بھی سمجھا دیا گیا۔

گویا زمین کے اپنے زیب وسنگھار (زینت) کے ساتھ ہونے کو 'حیات' کہا گیا اور اس سے محروم ہونے کو 'موت' کہا گیا۔ اسی طرح انسان کے اپنے شرف انسانی سے متصف ہونے اور اپنے رب کی بندگی کرنے اور اس کا شکر بجالانے کو 'زندگی' اور کفر اور ناشکری کو موت قرار دیا گیا

اس معنوی موت سے واپسی اور دوبارہ زندگی حاصل کر لینا 'توبہ' کا عمل ہے چنانچہ اگلی مثال اس بات کی وضاحت کے لئے ہے۔

مثال نمبر 3 ۔علی الاعلان مسلسل گناہ کی زندگی موت اور توبہ کے بعد کی زندگی 'حیات' ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يُحۡىِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ قَدۡ بَيَّنَّا لَـكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (الحدید۔17)

ترجمہ: ''جان رکھو کہ خدا ہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ ہم نے اپنی نشانیاں تم سے کھول کھول کر بیان کر دی ہیں تا کہ تم سمجھو''۔

یہاں منافقت کے ذکر کے بعد کہ منافق مسلمان اور کلمہ گو ہونے کے باوجود جنت سے محروم ہوگا اور کافروں کے ہمراہ جہنم میں جائے گا۔ اے مسلمانو! اس ابدی محرومی سے بچنے کا طریقہ آج 'توبہ' ہے اور اس کے بعد یہ آیت ہے یعنی ''اے اہل ایمان دیکھو اپنے رب سے ناامید مت ہونا جیسے وہ مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے اس طرح تمارے مردہ دلوں کو بھی (قرآن مجید کے ذریعے) زندہ کر سکتا ہے۔ بات ہم نے واضح کر دی ہے۔ اس پر عمل کرنا تمہارا کام ہے۔ آگے بڑھو توبہ کرو عقل سے کام لو اور غفلت کی راہ اختیار نہ کرو اور انجام بد سے اپنے آپ کو بچاؤ''۔

انفرادی موت وحیات

یہاں تک بات تھی انفرادی سطح پر ایک فرد بشر کی موت وحیات کے مختلف درجے اور متفرق جہتیں لیکن انسان دنیا میں صرف انفرادی طور پر نہیں رہتا بلکہ انفرادیت کے ساتھ وہ اجتماعیت کا بھی حصہ ہے اور انسان خاندان، برادری قبیلہ محلّہ شہر قوم اور ملک سے بھی پہچانا جاتا ہے۔

ایک اکیلے انسان کے مزاج کی طرح اجتماعی اور قومی سطح کا بھی مزاج ہوتا ہے اور وہ ان افراد کی پہچان بنتا ہے۔فرد کے مختصر تذکرے کے بعد اب آیئے !__________اجتماعی سطح پر حیات وممات کا جائزہ لیتے ہیں۔

مثال نمبر 4۔اجتماعی موت اور اجتماعی حیات

ارشاد باری تعالیٰ ہے!

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِیَارِھِمۡ وَھُمۡ اُلُوۡفٌ حَذَرَ الۡمَوۡتِ فَقَالَ لَھُمُ اللّٰہُ مُوۡتُوۡا ثُمَّ اَحۡیَاھُمۡ ط اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ط (البقرۃ۔243)

ترجمہ:''بھلاتم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو (شمار میں) ہزاروں ہی تھے اور موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل کر بھاگ گئے تھے تو خدا نے ان کو حکم دیا کہ مرجاؤ پھر ان کو زندہ بھی کردیا۔کچھ شک نہیں کہ خدا لوگوں پر مہربانی رکھتا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے''۔

یہاں بنی اسرائیل کے ایک دور کا تذکرہ ہے کہ وہ دین سے دور ہوگئے تھے اور گویا معنوی طور پر مر گئے تھے پھر اللہ ﷻ نے انہیں زندہ کر دیا یعنی بعض انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت سے ان میں جہاد اور قربانی کا جذبہ بیدار ہوا اس کو اللہ ﷻ ان کی زندگی قرار دے رہا ہے۔

اجتماعی سطح پر کسی قوم اور مجموعہ افراد کا اپنے نظریات بالخصوص انبیاء کرام علیہم السلام کے ماننے والوں کا اپنے مقتداؤں کی تعلیمات و ہدایات کو نظر انداز کرنا اور پس پشت ڈال دینا ان کو مانتے ہوئے بھی ان پر عمل نہ کرنا__________اس اجتماعیت کی 'موت' ہے اور کوشش کر کے اس اجتماعیت،قوم یا مجموعہ افراد کو اپنے 'ایمان' کے تقاضوں کی طرف بلانا اور ایک عرصے کی محنت کے بعد ان میں ایمانی کیفیات کا پیدا کر دینا ان کی 'حیات' ہے اور اس کا مطلب غلبہ دین اور غلبہ اسلام ہے اجتماعی سطح پر بے عملی اور دین سے دوری گویا 'موت' ہے بے عملی کو دور کرنا اور سوسائٹی کو اپنے مقصد وجود اور مقصد تخلیق کی طرف بلانا، اپنے ایمانی تقاضوں کا یاد دلانا اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات سے جوڑنے کی کوشش کرنا اس مردہ قوم اور مردہ سوسائٹی کو زندہ کرنے کے مترادف ہے۔

چنانچہ لسان حق ترجمان حضرت محمد ﷺ کی زبانی سنئے!

مَنْ جَاءَہُ الْمَوْتُ وَھُوَ یَطْلُبُ الْعِلْمَ لِیُحْیِیَ بِہِ الْاِسْلَامَ فَبَیْنَہ‘ وَبَیْنَ النَّبِیِّیْنَ دَرَجَۃٌ وَاحِدَۃٌ فِی الْجَنَّۃِ (دارمی عن الحسن مرسلاً)۔

ترجمہ: ’’جس شخص کو اس حالت میں موت آئی کہ وہ علم اس نیت سے حاصل کر رہا تھا۔ کہ اس کے ذریعے اسلام زندہ کرے۔ تو اس کے اور انبیاء علیہم السلام کے درمیان جنت میں صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا‘‘

اس حدیث پاک میں رسالت مآب ﷺ نے فرمایا کہ قوم اور سوسائٹی کو اللہ ﷻ کی طرف اور قرآن مجید کی طرف بلانا اور بدعملی سے نیک عملی کی طرف لانا اسلام کو زندہ کرنا ہے ’احیائے اسلام‘ کی اصطلاح یہیں سے بنی ہے گویا معاشرے اور اجتماعی سطح پر اسلام پر عمل درآمد ہے تو مسلمانوں کا معاشرہ زندہ ہے اور بے عملی ہے اور اس حد سے زیادہ گراوٹ ہے تو وہ معاشرہ مردہ اور بے جان معاشرہ ہے۔

غلامی اور آزادی

یہ بات انتہائی قابل غور ہے کہ معاشرے کی گراوٹ کا وہ درجہ جس کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے وہ کون سا درجہ ہے اور اس کی پہچان کیا ہے؟ تو اس کیلئے عام طور پر دنیا میں جو لفظ بولا جاتا ہے وہ ہے۔ ’غلامی‘ ایسی قوم جو دنیا میں اپنے نظریات پر قائم نہ رہ سکے اور بے عملی کا شکار ہوجائے وہ دوسروں کی غلام بنادی جاتی ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کے پیروکاروں کا معاشرہ یا مسلمان معاشرہ میں ان کو جگانا اور دینی جذبات کو اجاگر کرنا جہاد وقربانی کا جذبہ پیدا کرنا اور اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات پر عمل پر آمادہ کرنا زندگی اور حیات ہے اور احیائے اسلام ہے اور اس اجتماعی حیات کا مظہر اتم دنیا میں اسلام کا غلبہ اور حقیقی اسلامی ریاست کا قیام ہے اور ایسے لوگوں کا اللہ ﷻ کے ہاں قیام کے دن انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد یعنی صدیقین رضی اللہ عنہم کے برابر درجہ ہوگا۔

حیاتِ اجتماعی اور جہاد

اجتماعی سطح پر کسی مسلمان قوم کے معاشرے یا سوسائٹی کو اس کے اساسی نظریات قرآن وسنت کے قریب لانا یا عمل کی تحریک پیدا کرنا اس قوم کو حیات بخشنے کا عمل ہے چنانچہ اوپر درج آیات (بقرۃ۔243) کے فوراً بعد جو آیت وارد ہوئی ہے وہ جہاد وقتال کے بارے میں ہے۔

وَ قَا تِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ

(بقرۃ۔243)

ترجمہ: ''اور (مسلمانو) اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور جان رکھو کہ اللہ (سب کچھ) سنتا اور (سب کچھ) جانتا ہے''۔

اور اس جہاد وقتال کے لئے ناگزیر ہے جان ومال کا ایثار چنانچہ اگلی آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

مَنْ ذَالَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَناً فَیُضٰعِفَه' لَه' اَضْعَافًا کَثِیْرَةً ط وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُطُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (بقرۃ۔245)

ترجمہ: کوئی ہے کہ اللہ کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے اس کو کئی حصے زیادہ دے گا اور خدا ہی روزی کو تنگ کرتا ہے اور وہی اسے کشادہ کرتا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے''۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ محیّر العقول واقعہ ہے جس میں فتح کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی (آسمانی ہدایت کے مطابق) شاندار نظریاتی اور فلاحی ریاست قائم ہوئی جو ایک صدی تک بڑی شان وشوکت سے قائم رہی۔

یہ مثال مسلمانوں کے لئے سورۃ بقرۃ میں آئی ہے جس کے فوراً بعد جنگ بدر واقع ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اس میں بعینہ اسی طرح کَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً کَثِیْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ کے مصداق فتح عظیم عطا فرمائی جو مسلمانوں کی اجتماعی حیات (غلبہ اسلام) کا پہلا سنگ میل ثابت ہوئی

چنانچہ اسی موقع پر ارشاد ربانی ہے کہ اے مسلمانو! تمہارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ تمہیں جنگ بدر میں بلا رہے ہیں یہ تمہارے لئے بظاہر 'جنگ' اور جانوں کی قربانی کا مرحلہ ہے مگر حقیقتاً 'مسلمانوں کی حیات' یا 'انسانیت کی حیات' ہے ارشاد ربانی ہے۔

يآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ وَ اَنَّهٗ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (الانفال۔24)

ترجمہ: ''مومنو! اللہ اور اس کے رسول کا حکم قبول کرو جبکہ رسول اللہ تمہیں ایسے کام کے لئے بلاتے ہیں جو تم کو زندگی (جاوداں) بخشتا ہے اور جان رکھو کہ خدا آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہ تم سب اس کے روبرو جمع کئے جاؤ گے''۔

چنانچہ بظاہر جان کا خطرہ ہے اور شہادتیں ہیں مگر حقیقتاً۔ بقول شاعر

ع شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

افراد کی قربانیاں اور خون اجتماعیت کے لئے 'آب حیات' ثابت ہوتی ہیں۔

حیات وممات کی بحث میں ایک لطیف بات یہ ہے کہ جیسے اوپر واضح ہوا ہے کہ انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے اور حقیقی حیات تو روح اور جسم کے ساتھ ہی ہے یعنی حقیقی انسان وہ ہے جس کی روح اور ضمیر زندہ ہے اور خسارہ میں وہ انسان ہے جس کا جسم تو باقی ہے اور بظاہر زندہ ہے مگر ضمیر مردہ ہو چکا ہے اور 'روح' زندگی ہی میں تن سے الگ ہو چکی ہے۔

ایسے لوگوں کو قرآن 'چوپائے' بلکہ چوپایوں سے بھی بدتر قرار دیتا ہے۔ یعنی یہ لوگ چلتے پھرتے انسانی شکل میں جانور ہیں۔

روح اور جسم کا رشتہ عارضی ہے اور اس دنیا میں ہے یہ علیحدگی تو ہونا ہی ہے اور 'موت' پر روح اور جسم کا یہ عارضی 'انطباق' جدائی اختیار کر لے گا۔

مگر ــــــــــــــ ایک صورت بڑی خوفناک اور ناپسندیدہ ہے کہ انسان کی روح اس کی اپنی بداعمالیوں اور گھٹیا حرکتوں کی وجہ سے اسی دنیا میں تن سے جدا ہوئے اور وہ چلتا پھرتا 'حیوان' رہ جائے۔

اس صورت سے کہیں اعلیٰ وہ صورت ہے کہ انسان آگے بڑھ کر حق کی خاطر خود موت

کوقبول کرلے اور بالارادہ تن اور روح کا رشتہ راہ حق میں کٹوادے یا اس کا شدید جذبہ اور خواہش دل میں رکھے ــــــــــــــ یہ مرتبہ شہادت ہے۔

تیسری صورت نارمل ہے کہ انسان اوسط درجے میں کام کرتا کرتا طبعی موت مرے اور دنیا سے اچھائی لے کر رخصت ہو۔

اور چوتھی شکل بھی بری ہے کہ آدمی برائی کی خاطر جان دے یا خودکشی کرلے اللہ ﷻ ہمیں بری موت سے بچائے اور اچھی موت عطا فرمائے۔(آمین)

حیات اور حیاء

اس بحث کا آخری حصہ بہت مختصر مگر معنوی لحاظ سے بڑا اہم ہے اور وہ یہ ہے کہ حقیقی وجود تو 'روح' ہے اور جسم اس کا مرکب اور عارضی ''حیوانی'' وجود ہے۔جسم نظر آتا ہے روح غیر مرئی ہے تو ایک اوسط درجہ کے معقول انسان کے لئے کیسے ممکن ہے کہ وہ اندازہ لگا سکے کہ میرے اندر میری روح موجود ہے یا نہیں؟ اور وہ زندہ ہے اور اسے ''حیات'' کا اعلیٰ درجہ حاصل ہے یا کمتر یا قریب المرگ ہے یہ پہچان ہر انسان کی ضرورت ہے تا کہ اپنے اندرونی احوال اور کیفیات کا تجزیہ کر کے اپنے لئے اصلاح اور تربیت کی تدابیر کر سکے۔

اس شدید ضرورت کے احساس کو رب کائنات اور فاطر فطرت سے زیادہ کون جان سکتا ہے اس ذات عظیم نے اسکا بڑے شاندار انداز میں اہتمام فرمایا ہے تا کہ بینا و نابینا اور ہر کس و ناکس اور عامی و عالم اور پیر و جوان سب اس کی پہچان کر سکیں۔

اللہ ﷻ نے اسکے لئے انسان کے اندر نیکی بدی کی پہچان ودیعت کر دی ہے اور دنیا کا ہر انسان اس کا ادراک رکھتا ہے۔اسلئے ہر معاشرے میں انسانی اقدار کا تصور موجود ہے اور بری باتوں کیلئے سماجی برائیوں(SOCIAL EVILS) کا تصور عام ہے اور بلا استثناء دنیا کے ہر معاشرے میں بڑی گہری بنیادیں رکھتا ہے قرآن مجید میں اسے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ''پھر اسے بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی'' وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔یا حدیث پاک میں استفت قلبك کے الفاظ وارد ہیں یا ایک دوسری روایت میں ماالاثم یا رسول الله کے سوال پر جواباً ارشاد فرمایا اَلْاِثْمُ مَا حَاكَ فِیْ نَفْسِكَ (گناہ وہ

ہے جو تیرے دل میں کھٹکے)ان تمام وضاحتوں کے باوجود یہ بات اندرونی احساس اور داخلی کیفیات سے عبارت ہے اردو زبان میں اس کے لئے ضمیر کا لفظ عام ہے اور ان سب داخلی کیفیات اور احساسات کے لئے ایک لفظ ہماری دینی اصطلاح کے طور پر مستعمل ہے اور وہ ہے ــــــــــــ 'حیاء'۔

حیاء کا لفظ حیات سے بنا ہے اور اس کے معنی ہیں کہ اگر اندر کا انسان زندہ ہے تو انسان کے اندر 'حیاء' کا مادہ ہوگا اور اندر کا انسان مر چکا ہے ضمیر مردہ ہو چکا ہے (جس کی انتہائی کیفیت کا ذکر اعراف۔179 میں آیا ہے۔) تو حیاء ختم ہوگیا اسی بات کی عمومی وضاحت اور عوامی سطح پر افہام وتفہیم کی غرض سے جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا!

اِذَالَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ بِمَا شِئْتَ (بخاری)

ترجمہ: ''جب تو بے حیاء ہو جائے تو جو جی چاہے کر''

یعنی ــــــــــــ حیاء ختم ہو جائے اور انسان کے اندرونی احساسات ختم ہو گئے ہوں اور گاڑی کی بریک کی طرح انسان کو برائی سے روکنے کا داعیہ بے کار ہو گیا ہو تو اب ایسا انسان جو چاہے کر لے اس کے اندر کا انسان اسے کوئی لعنت وملامت نہیں کرے گا اور پشیمانی اور ندامت کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔

گویا ــــــــــــ حیاء ــــــــــــ انسان کے شرف انسانی کے ظہور اور اس کی حفاظت کا فطری اور قدرتی شاہکار بھی ہے اور انسانیت کا حسن بھی ہے۔ اس کی حفاظت اپنے شرف انسانی کے تحفظ کے لئے بہت ضروری ہے اور جدید دور میں اس حیاء کا محفوظ رہنا بھی شاید ناممکن ہے بقول اقبال ــــــــــــ وہ نصیحت جو انہوں نے اپنے بیٹے کو تعلیم کے لئے لندن روانگی پر کی تھی۔

؎ حیا زمانے کی آنکھ میں نہیں باقی خدا کرے تری جوانی رہے بے داغ

کاش آج کا مسلمان نوجوان (مرد عورت) بھی اپنی جوانی بے داغ رکھنے میں کامیاب ہو سکے (امین)۔

حیاء۔۔۔۔حیات روحانی

فرمان رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشنی میں

اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ(مسلم،ترمذی عن ابن عمرؓ)

حیا ایمان کا حصہ ہے

اَلْحَیَاءُ وَالْاِیْمَانُ مَقْرُوْنَانِ لَا یَفْتَرِقَانِ اِلَّا جَمِیْعًا (طبرانی عن ابی موسیٰؓ)

حیا اور ایمان جڑے ہوئے ہیں دونوں جدا نہیں ہوتے مگر اکٹھے

اَلْحَیَاءُ وَالْاِیْمَانُ قُرِنَا جَمِیْعًا فَاِذَا رُفِعَ اَحَدُھُمَا رُفِعَ الْآخَرُ(مستدرک عن ابن عمرؓ)

حیا اور ایمان جوڑ دیئے گئے ہیں جب ان میں سے ایک اٹھا لیا جائے تو دوسرا اٹھا لیا جاتا ہے

اَلْحَیَاءُ خَیْرٌ کُلُّہٗ (مسلم،ابوداؤد عن عمران ابن حصینؓ)

حیا ساری کی ساری خیر ہے

اَلْحَیَاءُ لَایَاْتِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ (متفق علیہ عن عمران ابن حصینؓ)

حیا ہمیشہ خیر ہی لاتی ہے

اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ وَالْاِیْمَانُ فِی الْجَنَّۃِ وَ الْبَذَاءُ مِنَ الْجَفَاءُ وَالْجَفَاءُ فِی النَّارِ (ترمذی عن ابی ھریرۃؓ)

حیا ایمان کا حصہ ہے اور ایمان جنت میں (جانے کا ذریعہ) ہے اور فحش گوئی بداخلاقی کی وجہ سے ہے اور دل کا سخت ہونا آگ میں (جانے کا ذریعہ) ہے

اَلْحَیَاءُ وَالْعَیُّ شُعْبَتَانِ مِنَ الْاِیْمَانِ وَالْبَذَاءُ وَالْبَیَانُ شُعْبَتَانِ مِنَ النِّفَاقُ (ترمذی،احمد عن ابی امامۃؓ)

حیا اور عاجزی دونوں ایمان کے شعبے ہیں فحش گوئی اور بیان دونوں نفاق کے شعبے ہیں

اَلْحَیَاءُ وَالْاِیْمَانُ فِیْ قَرْنٍ فَاِذَا سُلِبَ اَحَدُھُمَا تَبِعَہُ الْآخَرُ (طبرانی عن ابن عباسؓ)

حیا اور ایمان ایک ہی وقت میں ہوتے ہیں جب ان میں سے ایک سلب کر لیا جائے تو دوسرا بھی اس کے تابع ہوتا ہے

اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ وَاَحْیٰ اُمَّتِیْ عُثْمَانُ(ابن عساکر ابی ھریرۃؓ)

حیا ایمان کا حصہ ہے اور میری امت کا سب سے بڑا باحیا شخص حضرت عثمانؓ ہیں

تخلیق اور ارتقاء(3)

ساجد محمود مسلم

''ارتقاء'' کائنات میں جاری مسلّمہ اصولِ فطرت ہے تاہم کائناتی وحیاتیاتی ارتقاء کے متعلق ہر تصور صحیح نہیں۔خصوصاً چارلس ڈارون کا مخصوص تصوّرِ ارتقائے اکبر قرآنی تصوّرِ تخلیقِ اُمَم کے یکسر منافی ہے، جملہ حیاتیاتی شواہد ''ارتقائے اکبر'' کی نفی کرتے ہیں بالخصوص زندہ رکازات، ہرالمّہ کا اصلی کروموسوم نمبر اور مخصوص جینوم وغیرہ ارتقائے اکبر کی تردید کا بیّن ثبوت ہیں۔ان شواہد کی مزید تفصیل ذیل میں ملاحظہ کیجئے

جینوم کی شہادت (EVIDENCE FROM GENOMICS)

ہر نوع کا جینوم مخصوص نوعیت کا ہوتا ہے، لہٰذا ایک سادہ نوع سے مختلف اور پیچیدہ تر نوع کے ارتقاء کے لئے ضروری ہے کہ جینوم میں نئے اور منفرد جینز کا یکدم اضافہ ہو۔مثال کے طور پر ڈارون پرستوں کا دعویٰ ہے کہ کسی رینگنے والے جانور کے ارتقاء سے پرندے وجود میں آئے تھے۔ہم جانتے ہیں کہ رینگنے والے جانوروں میں پرندوں جیسے پروں (FEATHERS) کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ ماضی میں بھی پروں والے رینگنے والے جانور کا کوئی سراغ نہیں ملتا کیونکہ اس کی رکازی شہادت موجود نہیں۔آرکیوپیٹرکس(ARCHYOPTERIX) جسے رینگنے والے جانوروں اور پرندوں کی انتقالی شکل(TRANSITIONAL) کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اکثر ماہرین طیوریات (ORNITHOLOGY) کے نزدیک ایک مکمل پرندہ تھا۔

پرندوں کے پر محض اتفاقاً پیدا نہیں ہوتے بلکہ ان کی تشکیل کے لئے ایک منظّم ومرتب

منصوبہ کام کرتا ہے۔خلوی سطح پر ایک پیچیدہ اور مکمل نظام پروں کی تشکیل کا باعث بنتا ہے۔DNA اورRNA کے سینکڑوں نیوکلیوٹائڈز صرف پروں کی تشکیل کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ DNA سے جینز وہ مخصوص پروٹینز (PROTEINS) بنانے کی ہدایات جاری کرتے ہیں جو پروں کی بناوٹ کے لئے ضروری ہیں۔RNA ان ہدایات کے تحت وہی مخصوص پروٹینز بناتا ہے۔ یہاں پروں کی تشکیل کے طویل اور پیچیدہ عمل کو نہایت ہی سادہ اور مختصر سے لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ان کی اصل پیچیدگی اور نظم وربط سے ماہرین بخوبی آگاہ ہیں۔

اس بیان کا مقصد یہ ہے کہ پروں کو تشکیل دینے والے بیسیوں جینز پرندوں میں کہاں سے وارد ہوئے؟ رینگنے والے جانوروں میں تو یہ جینز سرے سے پائے ہی نہیں جاتے پھر ان کے ارتقاء سے پرندے کیسے وجود میں آسکتے تھے۔جبکہ یہ معلوم حقیقت ہے کہ کروموسومز کے انحرافات یا جینی تغیرات کے ذریعے نئے منفرد جینز پیدا نہیں ہوتے بلکہ پہلے سے موجود جینز کی ترتیب بدلتی ہے یا ان میں کمی ہوجاتی ہے یا انہی جینز کی نقول (COPIES) کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ 1970ء میں سسمو اوہنو (SUSMO OHNO) نے جین ڈپلیکیشن (GENE DUPLICATOIN) یعنی پہلے سے موجود بعض جینز کی نقول کے اضافہ کو پیچیدہ تر انواع اور نئے منفرد اعضاء کی تشکیل کا سب سے بڑا منبع قرار دیا تھا مگر 35 سال گزرنے کے باوجود جدید ترین ٹیکنالوجی کے علی الرغم، اس مفروضہ کی کوئی تجرباتی شہادت فراہم نہیں کی جاسکی۔اس کے برعکس شعاع ریزی (RUDIATION) اور تغیرات پیدا کرنے والے کیمیائی مادے کے مسلسل استعمال کے باوجود، ڈروسوفلا میں آج تک ایک بھی نیا منفرد اور کارآمد عضو پیدا نہیں ہوا۔ ڈارون پرست حقیقت سے ناواقف عوام کو چکمہ دینے کے لئے ایک عموما مثال پیش کرتے ہیں جسے اینٹینا پیڈیا (ANTENNAPEDIA) کہتے ہیں۔یہ اصطلاح اس جینی تغیر کے لئے وضع کی گئی ہے کہ جو ڈروسوفلا میں واقع ہوا اور اس کے نتیجے میں ڈروسوفلا کے محاسے (ANTENNA) کی جگہ پر ٹانگیں پیدا ہوگئیں۔ڈروسوفلا میں مختلف اعضاء کے مقام پیدائش کے تعین کے لئے جینز کا ایک سیٹ مخصوص ہے جسے HOX کہتے ہیں۔اس کی فطری ترتیب سے اعضاء اپنے فطری مقام پر پیدا ہوتے ہیں۔البتہ اس میں تغیر کی وجہ سے ٹانگیں، محاسوں کی جگہ ابھر

آتی ہیں اور محا سے غائب ہو جاتے ہیں۔ غلط جگہ پر ٹانگوں کے ابھرنے کو ایک نئے منفرد کارآمد اور اعضاء کی تشکیل کی دلیل قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ٹانگوں کے بننے کی ہدایات پر مشتمل جینز پہلے سے موجود تھے صرف ان کی ترتیب میں تبدیلی سے اضافی ٹانگیں غلط جگہ پر ابھر آئیں۔ لہٰذا اس صورت میں نہ تو نئے جین پیدا ہوئے نہ ہی اس کے نتیجے میں کوئی نیا منفرد اور کارآمد عضو پیدا ہوا۔ اس کے برعکس ڈروسوفلا کی مذکورہ نسل اپاہج اور معذور ہوگئی جو اس بات کی دلیل ہے کہ اگر فطرت میں بھی واقعتاً اس طرح کے اتفاقی (RANDOM) تغیرات سے کوئی عضو نمودار ہو بھی جائے تو وہ اس جاندار کو معذور اور نااہل بنا دے گا۔ درحقیقت انٹینا پیڈیا کی اس مثال کو زیادہ سے زیادہ جینی تغیرات (GENE MUTATIONS) کے وقوع کی دلیل قرار دیا جا سکتا ہے وہ بھی مضر یا غیر مفید تغیرات کی دلیل۔

معلوم ہوا کہ ایک سادہ نوع سے پیچیدہ تر اور منفرد نوع کے ظہور کے لئے جینوم میں ایسے غیر معمولی تغیرات کی ضرورت ہے جو بیک وقت بہت سی نئی اور مفید خصوصیات کا باعث بن سکیں۔ یاد رہے کہ مفید تغیرات کسی نوع کی آبادی میں موجود تمام یا اکثر افراد میں بیک وقت واقع نہیں ہوتے۔ بلکہ چند ہی افراد میں کوئی ایک آدھ مفید تغیر واقع ہوتا ہے، جبکہ کسی رینگنے والے جانور سے کسی پرندے کے ارتقاء کے لئے بہت سے مفید تغیرات کا بیک وقت ایک ہی فرد میں واقع ہونا ضروری ہے ورنہ پرندوں میں پروں کے ظہور کی کوئی حقیقت پسندانہ توجیہہ وتشریح نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ معلوم ومسلمہ حقیقت ہے کہ ایک ہی فرد میں بیک وقت اس قدر منظّم جینی تغیرات کا وقوع محال عقلی ہے جو پروں کی تشکیل میں ملوث پیچیدہ نظام وضع کر سکیں۔ ماحول میں کتنی ہی شدید تبدیلیاں ہوں جینی تغیرات کا وقوع کتنا ہی قریب الامکان ہو کسی رینگنے والے جانور کی نوع سے پرندے پیدا نہیں ہو سکتے۔

یہاں پرندوں کے پروں کی مثال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی بھی نیا پیچیدہ مفید عضو اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک جینوم میں شدید قسم کی تبدیلیاں رونما نہ ہوں اور یہ معلوم حقیقت ہے کہ کسی بھی نوع کا جینوم اس نوعیت کی غیر معمولی شدید تبدیلیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر کبھی اس نوعیت کی تبدیلی کسی نقص کی وجہ سے پیدا ہو ہی جائے تو اس کے نتیجے میں جنم لینے والا

جاندار انتہائی ناقص (DEFECTED) ،عجیب الخلقت (MALFORMED) اور معذور ہوتا ہے جو اپنی آئندہ زرخیز نسل پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ جبکہ ارتقاء کے لئے شرط ہے کہ ظاہر ہونے والے انحرافات نسل در نسل منتقل ہو سکتے ہوں۔

پس جینوم کی اس شہادت سے ڈارون پرستوں کی تمام رہی سہی امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے کیونکہ یہ شہادت ارتقاء اکبر کو قطعی طور پر غیر ممکن اور غیر معقول ثابت کرنے کے لئے حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہم ہر سلیم العقل شخص کو دعوت دیتے ہیں کہ ذرا دیر رک کر اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ کیا ایک جرثومہ (BACTERIUM) اور انسان کا جینوم ایک سا ہے؟ تمام ماہرین جینیات (GENETICES) اور جینومیات (GENOMICS) اس سوال کا جواب متفقہ طور پر نفی میں دیتے ہیں۔ لہٰذا جینوم کی بعض مشابہات کی بنیاد پر عقل یہ فرض کرنے کی اجازت کیسے دے سکتی ہے کہ سپر کمپیوٹر کا خالق حضرت انسان، ایک جرثومے یعنی بیکٹیریم کی ترقی یافتہ شکل ہے؟

فرض کر لیں کہ ابھی 'کیمبرین' دھماکہ دریافت نہیں ہوا، اور زمین صرف چار ارب نہیں بلکہ ایک کھرب سال پرانی ہے۔ کیا جینیات کے حقائق ایک جرثومے سے ترقی یافتہ انسان کے ظہور پر یقین کرنے کی اجازت پھر بھی دیتے ہیں؟ عقل صریح اس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔ ہم تخیل پسندوں سے کہتے ہیں کہ آپ شوق سے اپنے مافوق الفطرت اور دیومالائی تخیلات کی فضا میں پرواز کرتے ہوئے ایک بیکٹیریم سے انسان کا ارتقاء ہونے کا تصور باندھیں، مگر خدارا سلیم العقل لوگوں سے اپنے ان ''تخیلات'' کے ماننے پر اصرار مت کریں۔ سلیم العقل لوگ یقین رکھتے ہیں کہ کائنات کے واحد رب نے ہر امۃ کو جدا جدا تخلیق کیا ہے۔ جس کی شہادت تمام جدید تحقیقات دے رہی ہیں۔ لہٰذا آپ بے شک اپنے ان موہوم ''خیالات'' میں مست رہئے مگر 'تخلیق' مت جھٹلایئے جو کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔

بلاشبہ اللہ ﷻ کا فرمان سچا ہے کہ

ومامن دآبة فی الارض ولا طائر یطیر بجنا حیه الا امم امثالکم (الانعام 38)

''اورزمین پر چلنے والے تمام جانوروں اوراپنے دو پروں سے اڑنے والے
پرندوں کی تم جیسی امتیں ہیں۔''

ڈارون پرستوں کی تضاد بیانی:۔

ارتقاء کے موضوع پر لکھا گیا کوئی مضمون یا اس موضوع پر ضبط تحریر میں لائی گئی کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں ڈارون پرستوں نے جانداروں کے مابین مشابہات (RESEMBLANCES) کو موضوع سخن نہ بنایا ہو۔ ایسی ہی مشابہات کے لئے ایک اصطلاح مماثلت اعضاء یعنی ہومولوجی (HOMOLOGY) کثرت سے مستعمل ہے۔ وہ مماثلت اعضاء کوارتقاء اکبر کی نہایت قوی اور قائل کرنے والی دلیل قرار دیتے ہیں۔ اکثر کتابوں میں مماثلت اعضاء کیلئے انسانی بازو، پرندے کے بازو(WING) ،چھپکلی کی ٹانگ، وہیل (WHALE) کے فلپر اور گھوڑے یا کسی اور چوپائے کی ٹانگ کی مثال دی جاتی ہے۔ ان مذکورہ اعضاء کو مماثل اعضاء (HOMOLGUES) باور کرایا جاتا ہے، حالانکہ ان اعضاء کی صرف بیرونی ہی نہیں بلکہ اندرونی ساخت اور استعمال میں واضح اختلافات موجود ہیں۔ یہ اختلافات اس قدر واضح ہیں کہ خود ڈارون پرست جب مچھلیوں سے جل تھیلوں، جل تھیلوں سے رینگنے والے جانوروں اوران سے پرندوں اور ممالیہ جانوروں کے ارتقاء کی تفصیلات بیان کرتے ہیں تو انہیں ایک لفظ'' ترمیم'' (MODIFICATION) بار بار استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ پرندوں کے بازو رینگنے والے جانوروں کی اگلی ٹانگوں کی ترمیم شدہ شکل ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک جانب تو ان دونوں جدا جدا اعضاء کو مماثل قرار دیتے ہیں، یعنی یہ دونوں اعضاء اپنی بناوٹ میں ایک جیسے ہیں اور دوسری جانب یہ بھی کہتے ہیں کہ پرندوں کے بازو ترمیم شدہ شکل ہیں۔ اگر وہ واقعتاً پہلے ہی ایک جیسے ہیں تو ترمیم کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ یاد رہے کہ یہ بحث لغوی نوعیت کی نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت کی عکاسی کرتی ہے وہ یہ کہ جن اعضاء کو یہ ڈارون پرست مماثل قرار دیتے ہیں وہ فی الحقیقت مماثل نہیں کیونکہ ان کی بناوٹ اور کام کی نوعیت میں کوئی مماثلت نہیں مثلاً انسانی ہاتھ میں قلم وغیرہ کو خاص انداز میں پکڑنے کی صلاحیت ہے۔ یہ صلاحیت پرندے یا چمگادڑ کے پر (WING) وہیل کے فلپر، گھوڑے کے سم، مچھلی کے فن یا چھپکلی وغیرہ

کے اگلے یا پچھلے پاؤں میں ہرگز موجود نہیں۔ یہی نہیں انسانی ہاتھ سے قریبی مشابہت رکھنے والا چمپنزی یا گوریلا کا ہے۔ جس طرح انسان انگوٹھے، شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کی مدد سے قلم پکڑتا ہے، اس انداز میں چمپنزی یا گوریلا سدھانے کے باوجود نہیں پکڑ سکتا۔ اسی طرح پرندے کے بازو اڑنے کے لئے مخصوص ہیں۔ ان کے مقابلے میں انسان، گھوڑا، چھپکلی یا وہیل میں ہوا میں اڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے کیونکہ پرندوں کے بازو کی ہڈیاں اور باقی ہڈیاں اندر سے کھوکھلی ہوتی ہیں جبکہ دوسروں کے ساتھ ایسا نہیں۔ گھوڑے کے سم اس انداز میں تخلیق کئے گئے ہیں کہ اسے دوڑنے میں آسانی ہو اور دوڑتے ہوئے تلوے پہ بھی چوٹ نہ لگے۔ کیا انسان چھپکلی یا پرندے، زمین کی سطح پر گھوڑے کی طرح تیز دوڑ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ وہیل کا فلپر پانی میں تیرنے کے لئے مخصوص ہے، ان فلپرز کی مدد سے وہ سمندر میں میلوں کا سفر مسلسل تیر کے طے کر لیتی ہے۔ کیا انسان غوطہ خوری کا لباس پہننے کے باوجود یا آبی پرندے مثلاً بطخ وغیرہ مسلسل تیرتے ہوئے اس طرح میلوں کا سفر طے کر سکتے ہیں؟

جب کوئی سلیم العقل شخص ان حقایق پر غور کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقت چھپی نہیں رہ سکتی کہ مذکورہ بالا اعضاء کو مماثل قرار دے کر دھوکہ دیا جاتا ہے تاکہ ڈارون کا یہ مفروضہ تسلیم کر لیا جائے کہ تمام فقاریہ جانور بشمول انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ بالفاظ دیگر انسان، پرندے، ممالیہ جانور، رینگنے والے جانور، جل تھلے اور مچھلیاں سب ایک ہی جد اعلیٰ سے ارتقاء پذیر ہونے کی وجہ سے ایک امۃ ہیں۔ اگر مذکورہ اعضاء میں تھوڑی سی مشابہت موجود بھی ہے تب بھی ان اعضاء کے حاملین کو ایک امۃ قرار دینا عصر حاضر کی تمام تحقیقات کی نفی کرنے کے مترادف ہے۔ ہم اپنے اس دعویٰ کے دلائل رکازات، کروموسومز اور جینوم کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں جن کو یہاں دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

ڈارون کا مذکورہ دعویٰ کہ سب جانور اور انسان ایک امۃ ہیں۔ قرآن کے تصور امۃ کے قطعی منافی ہے۔ قرآن نے جانوروں کی امتوں کو انسانی امۃ سے تشبیہ دی ہے۔ ''امم امثالکم'' کی ترکیب ہمارے اس دعویٰ کے لئے کافی وشافی ہے۔ جانوروں کے گروہوں کے لئے عرب محاورہ میں مستعمل لفظ عَصَائِب (واحد عِصَابَۃ) عَصَب (واحد

عُصبَة)ابابیل (اس کا واحد نہیں ہے)اَفرِقَة (واحد فَرِیق) وغیرہ کی بجائے امم کا خصوصی طور پر استعمال واضح کرتا ہے کہ یہاں صرف جانوروں کے گروہوں کی تقسیم بتلانا مقصود نہیں بلکہ ان کی اصل وابتداء کا تصور واضح کرنا ہے۔جس طرح انسانوں کی ابتداء ایک جوڑے سے ہوئی ہے اسی طرح کی ہر امۃ کی ابتداء ایک جوڑے سے ہوئی۔ جانوروں کی امتوں کو انسانوں کی امۃ سے تشبیہ دینے کی یہی معقول وجہ دکھائی دیتی ہے۔واللہ اعلم بالصواب

بعض دیگر قرآنی آیات سے بھی مذکورہ مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

فاطر السمٰوٰت والارض جعل لکم من انفسکم ازواجا و من الانعام ازواجا (الشوریٰ 11)

''وہی آسمانوں اور زمین کو اول بار عدم سے پیدا کرنے والا ہے۔اس نے تمہارے واسطے خود تمہارے اور جانوروں کے جوڑے پیدا کئے۔''

نیز فرمایا!

سبحٰن الذی خلق الازواج کلها مماتنبت الارض ومن انفسهم ومما لایعلمون (یسین 36)

پاک ہے وہ ذات جس نے سب جوڑے پیدا کئے۔خواہ وہ زمین سے اگنے والے پودے (کے جوڑے) ہوں یا خود ان کے اپنے (جوڑے) ہوں یا ان چیزوں (کے جوڑے) ہوں جنہیں یہ جانتے تک نہیں۔''

قرآن مجید اور علم جدید (SCIENCE) کی روشنی میں جانداروں کی تخلیق اور عمل تنوع کی حقیقت اب بالکل نکھر کر سامنے آچکی ہے۔امۃ الناس کی ابتداء جس نمائندہ جوڑے کی تخلیق سے ہوئی وہ دیگر جانداروں کی طرح محض پانی سے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اولا پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو پانی سے گوندھی ہوئی خاص مٹی یعنی گارے سے متشکل کیا گیا پھر رب تعالی نے شرف انسانی کو چار چاند لگانے اور نوع انسانی کو تمام مخلوقات پر فضیلت بخشنے کے لئے اپنی جناب سے ان میں روح پھونک کر انہیں زندہ و متحرک بنا دیا۔ یوں ایک جیتا جاگتا، صاحب فہم و عقل اور صاحب زبان انسان معرض وجود میں آیا۔ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے مختلف مراحل

قرآن میں متفرق مقامات پر وارد ہوئے ہیں۔ پیدائش کی ابتدائی حالت کے متعلق فرمایا!

الذی احسن کل شیء خلقه وبدأ خلق الانسان من طین
(السجد7)

''اس نے ہر چیز کو بہت اچھی طرح بنایا اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی۔''

مذکورہ مٹی کوئی عام سی مٹی نہ تھی بلکہ مٹی کے تمام اجزاء کا خلاصہ تھی۔ جیسا کہ ارشاد ہے

ولقد خلقنا الانسان من سلٰلة من طین (المؤمنون12)

''اور ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا فرمایا۔''

خاص مٹی کے جوہر میں پانی ملا کے اسے گوندھا گیا جس سے وہ گارے میں تبدیل ہوگئی چنانچہ ارشاد ہے!

فاستفتهم اهم اشد خلقاً ام من خلقنا انا خلقنٰهم من طین لازبo بل عجبت ویسخرون o (الصٰفٰت11:12)

ان (منکرین حق) سے پوچھو کہ کیا تمہیں پیدا کرنا زیادہ سخت کام ہے یا وہ سب کچھ جو جو ہم نے پیدا کر دیا۔ ہم نے ان (انسانوں) کو چپکتی ہوئی مٹی گارے سے پیدا کیا۔ آپ کو بھلا لگتا ہے۔ اور یہ (اس حقیقت کا) مذاق اڑا رہے ہیں۔''

گارے سے انسان کی پیدائش عقل کے لئے واقعتاً تعجب انگیز ہے مگر جس رب قدیر نے ساری کائنات کو محض عدم سے پیدا فرما دیا اس کے لئے یہ چنداں مشکل نہیں، اسی طرح گارے سے حضرت آدم علیہ السلام کا قالب مبارک تخلیق کیا گیا۔ یہاں تک کہ یہ قالب کچے گھڑوں کی مانند سوکھ کر بجنے لگا۔ جس میں اللہ ﷻ نے اپنی طرف سے روح پھونک دی :۔

خلق الانسان من صلصا ل کالفخّار (الرحمٰن14)

''اسی (رب) نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے بنایا۔''

واذقال ربك للملٰئکة انی خالق بشرا من صلصال من

حما مسنون o واذا سویته و نفخت فیه من روحی
فقعوا له سٰجدینo(الحجر28:29)

''اور جب تمہارے رب نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں خمیر اٹھے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے، ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں تو جب میں اسے پوری طرح بنادوں اور اس میں اپنی جناب سے روح پھونک دوں تو تم سب اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔''

یہ بشر یا انسان جس کا مذکورہ بالا آیات میں تذکرہ ہوا ہے۔ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام ہیں جن کو انتہائی معجزانہ انداز میں بن ماں باپ کے محض مٹی کے جوہر خاص سے پیدا فرمادیا۔ ارشاد ہے:

ان مثل عیسی عندالله کمثل آدم خلقه من تراب ثم قال له کن فیکونo الحق من ربك فلاتکن من الممترینo
(آل عمران60:59)

''یقیناً اللہ کے نزدیک عیسی (علیہ السلام) کی مثال آدم (علیہ السلام) جیسی ہے۔ جنہیں اس نے مٹی سے بنایا پھر ان سے فرمایا کہ (زندہ) ہو جا پس وہ (زندہ) ہو گئے۔ یہ بات تمہارے رب کی جانب سے بالکل سچ ہے، تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو جانا۔''

اہل اسلام کا اجماعی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کو بن باپ کے خصوصی طور پر معجزانہ انداز میں تخلیق فرمایا گیا۔ اسی مناسبت سے انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی مثل قرار دیا گیا ہے۔ اس حقیقت سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ایک فرد واحد مشخص کا نام گرامی ہے۔ جن کا کوئی باپ نہ تھا۔ کوئی دوسرا انسان یا ''حیوان انسان'' آپ کی خصوصی تخلیق کے وقت موجود نہ تھا۔ چنانچہ آپ ہی ہر اعتبار سے ابوالبشر ہیں، روحانی اعتبار سے بھی اور جسمانی اعتبار سے بھی، اہل السنہ والجماعہ کا ہمیشہ سے یہی عقیدہ چلا آرہا ہے۔ یہ عقیدہ ''عوامی ایجاد'' نہیں بلکہ جمہور مفسرین اور دیگر علمائے اسلامی یہی عقیدہ بیان کرتے آئے ہیں:(10)

حضرت آدم علیہ السلام کی خصوصی تخلیق کے بعد انہی کی جنس سے ان کی زوجہ محترمہ حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا فرمایا۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

وخلق منها زوجها

''اور اسی کی جنس سے اس کی بیوی کو پیدا کیا''

حضرت حوا علیہا السلام کی تخلیق کی تفصیلات قرآن اور صحیح احادیث میں مفقود ہیں۔ البتہ صحیح احادیث میں اتنا اشارہ ضرور ہے کہ عورت کو پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔ شارحین حدیث کے ہاں پسلی سے عورت کی تخلیق کے مفہوم میں کافی اختلاف موجود ہے۔ عصری تحقیقات کی روشنی میں دیکھا جائے تو عین ممکن ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی یا پہلو کے کسی ایک خلیہ (CELL) کی نقول تیار کی گئی ہوں اور اس کی کلوننگ (CLONING) سے حضرت حوا پیدا ہوئی ہوں۔ صنف تبدیل کرنے کے لئے وائی کروموسوم کی تحذیف (DELETION) اور ایکس کروموسوم کا اضعاف (DUPLICATION) چنداں بعید نہیں (والله اعلم بالصواب ویخلق مایشاء)

غرضیکہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام دونوں کی تخلیق عام قاعدہ تزویج سے نہیں بلکہ بن ماں باپ کے ہوئی۔ حضرت آدم علیہ السلام ابوالبشر (سب انسانوں کے باپ) اور حضرت حوا علی ہعلیہما السلام ام البشر (سب انسانوں کی ماں) ہیں۔ انسانوں کا وائی کروموسوم ثابت کرتا ہے کہ سب انسانوں کا باپ ایک ہی تھا۔ اسی طرح سب انسانوں کا مائٹو کونڈریل ڈی این اے (MITOCHONDRIAL DNA) ثابت کرتا ہے کہ سب انسانوں کی ماں ایک ہی تھی، حیاتیات (BIOLOGY) کے شعبہ سے منسلک ماہرین مذکورہ حقائق سے بخوبی واقف ہیں۔

قرآن وحدیث کے متفقہ عقیدہ تخلیق کے برعکس ڈارون اور اس کے متبعین کا فرضی تخیل ہے کہ بندروں جیسے کسی ممالیہ جانو میں عمل تنوع واقع ہونے کی وجہ سے بوزنے (APES) اور اولین وحشی انسان آسٹریلوپتھیکس (AUSTRALOPITHECUS) ظہور پذیر ہوئے۔ اسی حیوان نما انسان یعنی آسٹریلوپتھیکس میں ترقی ہوئی تو ہوموہیبیلس (HOMO HABILIS) نامی انسان وجود میں آئے۔ پھر اس نوع میں اور ترقی کے نتیجہ میں اولین سیدھے چلنے والے وحشی انسان ہوموار یکٹس (H. ERECTUS) زمین پر نمودار ہوئے۔ انہی وحشی

انسانوں نے ترقی کر کے درجہ بدرجہ موجودہ انسانوں کی شکل اختیار کر لی۔

''ارتقاء اکبر'' کے اس آخری درجہ کے متعلق گھڑے گئے سارے خاکے اور قصے نہایت نامعقول اور احمقانہ ہیں۔ یہ سارے قصے اور مفروضے نامکمل ڈھانچوں اور ہڈیوں کے چند ٹکڑوں کی بنیاد پر گھڑے گئے ہیں۔ ان فرضی خاکوں میں رنگ بھرنے اور چمک دمک پیدا کرنے کا سارا کام الحاد پرستوں کے ملحدانہ تخیلات نے سرانجام دیا ہے۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ جن قدیم ترین ڈھانچوں کو انسانی ڈھانچے قرار دیا جا رہا ہے وہ درحقیقت قدیم بوزنوں ہی کی بعض انواع سے تعلق رکھتے ہیں جو موجودہ بوزنوں کی نسبت زیادہ سیدھا کھڑے ہو سکتے تھے۔ ان ڈھانچوں کے غیر انسانی ہونے کی یہ دلیل ہے کہ قرآن مقدس میں قوم عاد کا بیان اور احادیث صحیحہ میں حضرت آدم علیہ السلام کا قد 60 ذراع (تقریباً 90 فٹ) ہونے کا ناقابل تردید بیان ثابت کرتا ہے کہ قدیم ترین انسان نہایت بلند قامت اور قوی الجثہ تھے۔ جس کی عصری شہادت کرومینن انسان (CROMAGNON) یعنی ہوموسیپی انزنیدرتھیلنسز (HOMO SAPIENS NEADERTHELENSIS) کے عظیم الجثہ ڈھانچے ہیں جن میں سے بعض کی دماغی وسعت 1800 سی سی تک پہنچ چکی ہے جبکہ موجودہ انسانوں کی اوسط دماغی وسعت صرف 1450 سی سی ہے۔

ان انسانی ڈھانچوں کے برعکس HOMO SAPIENS کے سوا ہومی نیڈی (HOMINIDAE) خاندان کی باقی تمام انواع کی اوسط دماغی وسعت محض 600 سی سی ہے۔ یہ دماغی وسعت انسان کے مقابلے میں گوریلا (GORIALLA) کے زیادہ مشابہ ہے جس کی اوسط دماغی وسعت 510 سی سی ہے۔ لہٰذا ہومی نیڈی خاندان کی تمام انواع سوائے HOMO SAPIENS کے، درحقیقت قدیم بوزنوں کی انواع ہیں انسانوں کی نہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں بوزنوں اور انسانوں کے مابین صرف دماغی وسعت کا موازنہ کیا گیا ہے جو تنہا انہیں جدا جدا امۃ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے تاہم ان کے مابین جسمانی نقوش و بناوٹ کا جس انداز سے بھی موازنہ کیا جائے، انہیں ایک ہی جد اعلیٰ کی اولاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اصل امتیازات جن کی وجہ سے حضرت انسان کو باقی تمام مخلوقات حتیٰ کہ

ملائکہ پر بھی فوقیت حاصل ہے، ان میں بوزنوں کو ذرا بھی سا جھا نہیں۔ انبیاء میں وحی الٰہی کو وصول کرنے اور سمجھنے کی صلاحیت، من حیث النوع تمام انسانوں میں مرتب الفاظ کی صورت میں اپنے تخیلات اور مافی الضمیر کو بیان کرنے کی غیر معمولی صلاحیت، سپر کمپیوٹر کو تخلیق کرنے اور اسے مات کر دینے والی بے مثل ذہانت، ہاتھوں کے انگوٹھوں کی مدد سے گرفت (GRIP) کرنے کی صلاحیت، فطری حیا مثلاً شہوت کی صورت میں ماں، بہن، بیٹی، اور بیوی میں تمیز کرنے کا جذبہ وعادت اور دیگر تمام مکارم اخلاق جو فی الواقعہ انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ تمام بڑے دماغ والے میملز میں ہی نہیں بلکہ تمام جانوروں میں مفقود ہیں۔ پس نفخ روح ربانی کے باوجود ہم کیسے مان لیں کہ انسان ایک حیوان محض ہے اور بس۔

ہم ببانگ دہل کہتے ہیں کہ جس طرح حیوانات، نباتات کے ساتھ بہت سی مشابہتیں رکھنے کے باوجود نباتات میں شمار نہیں کئے جاتے اسی طرح انسان کی جانوروں کے ساتھ چند مشابہتوں کی بناء پر اسے جانور قرار دے کر عالم حیوانات (KINGDOM ANIMILIA) کا ایک ادنیٰ فرد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ یہ مروجہ تقسیم سراسر لغو اور حیاتیاتی حقائق کی نفی کرتی ہے۔ لہٰذا ہم مذہبی تعصب کی بناء پر نہیں بلکہ حیاتیاتی حقائق کی برتری کے لئے مروجہ انسانی درجہ بندی (CLASSIFICATION) کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ماہرین حیاتیات کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ عالم نباتات (KINGDOM PLANTA) اور عالم حیوانات (KINGDOM ANIMALIA) کے متوازی تیسرا گروہ عالم انسانیہ (KINGDOM ANTHROPIA) کا وجود تسلیم کرتے ہوئے عالمی سطح پر اس کی تنفیذ کو یقینی بنائیں۔ رہے اہل اسلام اور علمائے یہودیت وعیسائیت تو ان کے لئے اس حقیقت کو تسلیم کرنے اور اس کی تشہیر کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔

10۔ مجموع فتاویٰ ابن تیمیہؒ جلد 17 صفحہ 259,267 جلد 16 صفحہ 261

قرآن اکیڈمی ملتان میں خطابات کا سلسلہ

تیسرا خطاب

قرآن ہمارا

انجینئر مختار فاروقی

قرآن اکیڈمی ملتان میں خطابات کا سلسلہ

تیسرا خطاب

قرآن ہمارا

انجینئر مختار فاروقی

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم امابعد:

فاعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

ان ھٰذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم ویبشر المؤمنین الذین یعملون الصٰلحٰت ان لھم اجرا کبیراo وان الذین لایؤمنون بالاٰخرۃ اعتدنا لھم عذاباً الیما o(الاسرآ۔9)

قال النبی ﷺ خیرکم من تعلّم القرآن وعلّمہ

و قال النبی ﷺ ان اللّٰہ یرفع بھٰذا الکتاب اقواماً و یضع بہ اٰخرین وقال النبی ﷺ ومن عمل بہ اجر ومن حکم بہ عدل ومن دعاالیہ ھدی الی صراط مستقیم۔او کما قال علیہ الصلاۃ والسلام

حضرات ہماری آج کی گفتگو کا عنوان ہے ''قرآن ہمارا'' جس ترتیب سے یہ عنوانات ان نشستوں میں چل رہے ہیں بہت ہی بالغ نظری سے انہیں ترتیب دیا گیا ہے میرے سامنے کل ہی یہ سارے عنوانات آئے ہیں پہلے مجھے صرف میرا عنوان بتایا گیا تھا میں اسی پر غور کرتا رہا کہ آپ حضرات کے سامنے کیا باتیں رکھنی چاہئیں پھر میں نے فون کر کے معلوم کیا کہ اس سات روزہ پروگرام میں باقی عنوانات کیا ہیں تو جب مجھے وہ معلوم ہوئے کہ تو احساس ہوا کہ واقعتاً عقلمندی اور بہت دیدہ ریزی سے عنوان بنائے گئے ہیں، وہ خطابات جو ہو چکے ہیں وہ واقعتاً پہلے

ہی ہونے چاہئیں تھے اور آج کا خطاب انہیں سے جڑا ہوا ہے اور انہیں کا منطقی نتیجہ ہے پہلے خطاب ''رب ہمارا'' میں جو باتیں آپ کے سامنے آئیں ہیں اس میں ایک بات میں بھی اپنے انداز میں دہرانا چاہوں گا اور اسی طرح دوسرے خطاب ''رسول ہمارا ﷺ'' کے حوالے سے بھی ایک بات آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا تا کہ آج کے عنوان کے ساتھ وہ دونوں موضوع جڑ جائیں پھر کچھ باتیں آج کے عنوان سے متعلق آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

''رب ہمارا''، ہم کلمہ پڑھتے ہیں جس کا پہلا حصہ ہے لا الٰہ الا اللّٰہ اور دوسرا حصہ ہے محمد رسول اللّٰہ یہ بات آپ کے سامنے آئی ہوگی کہ اللہ ﷻ کو اپنا رب اور مالک ماننا اور اس ماننے کی حیثیت سے ہم پر تقاضا بنتا ہے کہ ہم اس اللہ ﷻ کی اطاعت کریں، مالک مان لینا ایک بات ہے اور اس کا جو تقاضا ہے کہ ہم اس اللہ ﷻ کی اس رب کی اطاعت کریں اس کا کہا مانیں یہ دوسری بات ہے دین کی اصطلاح میں اسے عبادت کہتے ہیں۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون o

سورۃ قریش میں فرمایا!

لایلٰف قریش o ایلٰفھم رحلۃ الشتاء والصیف o فلیعبدو رب
ھٰذا البیت o الذی اطعمھم من جوع واٰمنھم من خوف o

اللہ ﷻ تو تمہارا رب ہے، تمہارا مالک ہے، تمہیں کھلا رہا ہے، پلا رہا ہے تو تمہارے ذمہ یہ ہے کہ تم اس اللہ ﷻ کی بندگی کرو___________ الحمدللہ ہم مسلمان ہیں اور اکثر و بیشتر قرآن اور حدیث کی باتیں سنتے رہتے ہیں دین کی اصطلاحات سے واقف ہیں جہاں اس کا فائدہ ہے کہ ہم دینی اصطلاحات سے واقف ہیں وہاں آج کے ماحول میں اس کا چھوٹا سا نقصان کا پہلو بھی ہے کہ ہم عبادت کا لفظ سنتے ہیں تو عبادت کا جو نقشہ ماحول کے مطابق ہمارے ذہن میں ہے وہ سامنے آجاتا ہے اور اس سے آگے ہم سوچتے ہی نہیں ہیں کہ ''عبادت عبادت ہے بس اللہ اللہ خیر سلا'' عبادت کا حقیقی مفہوم کیا ہے اس کے تقاضے کیا ہیں؟ ادھر ہماری توجہ نہیں جاتی ہے تو جس بات کی طرف میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں ''رب ہمارا'' کے حوالے سے کہ اللہ ﷻ کو رب جاننا اور اس کی عبادت کرنا، اس کا کہنا ماننا، اس کی اطاعت کرنا___________ سورۃ فاتحہ نماز میں ہم

پڑھتے ہیں اور اللہ ﷻ سے ہم ہدایت مانگتے ہیں (اھدنا الصراط المستقیم) کہ اے اللہ تو ہمیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت عطا فرما (صراط الذین انعمت علیھم) ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا انعام ہوا' اور پھر سورۃ النساء میں جا کر اس کی وضاحت فرمائی کہ وہ ہدایت یافتہ اور انعام یافتہ لوگ کون ہیں؟ اللہ ﷻ نے فرمایا (ومن یطع اللہ والرسول فالئك مع الذین انعم اللہ علیھم) ''جو اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرے گا وہی انعام یافتہ لوگوں کے ساتھ ہے'' سیدھے راستے (ہدایت) پر چلنا ہے تو اللہ ﷻ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرنا ہوگی۔ اسی کو ایک اور پہلو سے بھی دیکھیں جس سے میں اپنے موضوع کو جوڑنا چاہتا ہوں کہ ہم میں سے کچھ لوگ تاریخ سے واقف ہیں ہی، اور آج کی دنیا کے حالات سے بھی واقف ہیں دنیا میں یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ ﷻ کو ماننے والے اور اللہ ﷻ کا نام لینے والے لوگ بہت زیادہ ہیں اور نہ ماننے والے ملحد قسم کے لوگ بہت کم ہیں دنیا میں اس وقت عیسائی سوا دو کروڑ ہیں اور تقریباً ایک سو تیس یا چالیس کروڑ مسلمان ہیں اس کے علاوہ بھی بہت سارے لوگ اللہ ﷻ کو مانتے ہیں، اللہ ﷻ کا نام لیتے ہیں لیکن اللہ کا نام لینا اور ہے اللہ ﷻ کا کہنا ماننا اور ہے، دنیا میں اللہ ﷻ کا نام لینے والے تاریخ میں بھی بہت ہیں آجکل بھی بہت ہیں لیکن جیسے یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ اللہ ﷻ کا انکار کرنے والے لوگ بہت تھوڑے ہیں اسی طرح اللہ ﷻ کو صحیح طور پر قرآن وحدیث کے تقاضوں کے مطابق ماننے والے بھی بہت قلیل ہیں، شاید انکار کرنے والوں سے بھی قلیل ہیں آج کا انسان، مغرب کا انسان بلکہ صرف مغرب کی بات نہیں ہمارے ہاں بھی جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لوگ ہیں جو کہ نہ صرف ڈگری حاصل کر لیتے ہے بلکہ مغربی افکار ان کے ذہن میں سمائے ہوئے ہیں مثلاً ڈارون تھیوری، فرائڈ تھیوری ان کے ذہن میں سوار ہو جائے اور کوئی LOGIC اور کوئی منطق ان کے دماغ میں جا گزریں ہو جائے۔ تو اس کا وہ نتیجہ نکلتا ہے جو سورۃ یٰسین میں اللہ ﷻ نے اس دور کے لوگوں کے بارے میں فرمایا (وما انزل الرحمٰن من شیء) یعنی اللہ ﷻ نے انسان کو پیدا فرمایا اور اس کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس کو عقل دے دی اب مزید کسی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے، اس کو انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت نہیں ہے، اب وہ اپنی عقل کے تحت جو چاہے کرے جو چاہے کھائے پیئے، اب اس کو کسی EXTERNAL یا کسی

خارجی ہدایت کی کوئی ضرورت نہیں ہے گویا کہ رسالت، نبوت اور وحی کا انکار کر دیا اس طرح کے لوگ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی تھے آج بھی بہت ہیں، مغرب کا انسان اور جدید تعلیم یافتہ انسان اسی بات کو اپنے ذہن میں چھپائے ہوئے ہے یا اسی کا دعویٰ کر رہا ہے کہ میں انسان ہوں میں نے ایم اے کیا ہے، پی ایچ ڈی کیا ہے، ڈاکٹریٹ کیا ہے، ایم بی اے کیا ہے، میں عقل رکھتا ہوں اب مجھے کون سمجھانے والا ہوسکتا ہے میں جو چاہوں گا اپنی عقل سے خود فیصلہ کروں گا کہ کیا کھانا ہے، کیا پینا ہے، کیا دیکھنا ہے، کیا سننا ہے، کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے۔ لوگ اللہ ﷻ کا کہنا ماننے سے انکاری ہیں اس کو سادہ الفاظ میں یوں سمجھئے لوگ اللہ ﷻ کو مانتے ہیں کہ اللہ ﷻ کوئی ہے جس نے کائنات بنائی اب وہ کہیں بیٹھا ہے بس! ارسطو بھی مانتا تھا افلاطون بھی مانتا تھا اور جو منکرین خدا ہیں وہ بھی کہتے ہیں کہ اس کائنات کا خالق کوئی ہے لیکن وہ عضو معطل کی طرح (DEFUNCTIONING) ہے یعنی اس کائنات میں اس کا اب کوئی عمل دخل نہیں ہے، وہ ہمیں کسی کام سے روک نہیں سکتا، ہمیں کوئی حکم نہیں دے سکتا جبکہ قرآن وحدیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ﷻ زندہ ہے، دیکھتا ہے، سنتا ہے، وہ رب خالق مالک ہے، وہ ہمیں بتاتا ہے کہ تم یہ کرو گے اور یہ کام نہیں کرو گے، وہ ناراض بھی ہوتا ہے اور خوش بھی ہوتا ہے۔ یہ کرو گے تو اس سے اللہ ﷻ راضی ہوگا، یہ کرو گے تو اس سے اللہ ﷻ ناراض ہوگا۔ لوگ اس انداز سے اللہ ﷻ کو ماننے کے لئے تیار ہی نہیں مغرب میں تو بے شمار لوگ ہیں ہی ــــــــــــــ ہم مسلمانوں میں سے بھی بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ایسے خدا کو ہم نہیں مانتے، ایسے اللہ ﷻ کا تصور ہم نہیں رکھتے بھئی میں فلم دیکھنا چاہتا ہوں یا میں کوئی اور چیز دیکھنا چاہتا ہوں، میں کوئی چیز کھانا چاہتا ہوں، میں کوئی پسندیدہ لباس پہننا چاہتا ہوں اللہ ﷻ کون ہوتا ہے روکنے والا؟ (نعوذباللہ من ذٰلك) یہ مزاج آج بھی مسلمانوں میں سے بہت سے لوگوں کا ہے، اگر اس کا تجزیہ کیا جائے کہ مسلمانوں میں بے عملی کیوں ہے اس کا جواب یہی ہوگا کہ لوگ اللہ ﷻ کا کہا ماننے کو تیار ہی نہیں، ایسے اللہ ﷻ کو نہیں مانتے جو یہ کہے کہ یہ کرو یہ نہ کرو، ایسے سوؤ، ایسے اٹھو، ایسے غسل خانے جاؤ، ایسے جاگو اور صبح یہ کام کرو اور اٹھتے ہوئے یہ کام کرو وہ ایسے خدا کو نہیں مانتے ہیں۔ گویا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ ﷻ نے کائنات بنائی ہے اب کہیں بیٹھا ہوگا میرا اس کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں۔ تو اللہ ﷻ کو خالق

کائنات ماننا یہ اپنی جگہ حقیقت ہے لوگ مانتے ہیں لیکن جو قرآن کا تقاضا ہے جو دین کا تقاضا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بات کی کہ ایسے اللہ کو مانو جو ہمیں حکم دیتا ہے جو LAW GIVER ہے وہ کچھ چیزوں سے منع کرتا ہے اور کچھ چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ہمیں بحیثیت انسان بحیثیت بندہ ان چیزوں کو OBSERVE کرنا ہوگا اگر ہم اس اللہ ﷻ کا کہنا مانیں گے اور ان حدود کے اندر رہیں گے تو ہم بندے ہیں اور وہ رب ہے، اگر ہم اپنی مرضی کریں گے جیسے کہ آج بے شمار لوگ ہیں کوئی سود کھا رہا ہے، کوئی رشوت کھا رہا ہے، کوئی بے حیائی کے کام کر رہا ہے اور کوئی غلط کام کر رہا ہے اگر اس کو کہا جائے کہ بھائی اللہ ﷻ نے اس کام سے منع کر رکھا ہے تو کیا وہ اس سے رک جائے گا نہیں بلکہ کہے گا رکھوا اپنے پاس۔ مطلب کیا ہوا کہ لوگ اللہ ﷻ کو رب مانتے تو ہیں لیکن رب کا جو مفہوم ہے اس کو ماننے کو تیار نہیں رب کا مفہوم یہ ہے کہ وہ رب ایسا رب ہے کہ جو احکام دے سکتا ہے (ان الله يحكم ما يريد) سورۃ المائدہ میں فرمایا! وہ جو چاہے (تمہیں) حکم دے سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ہمارا پیدا کرنے والا ہے ہماری فطرت سے واقف ہے اس نے جو بھی حکم دیا ہے ہمارے فائدے کے لئے دیا ہے لیکن یہ کہ اس پر ہم کوئی قدغن نہیں لگا سکتے کہ صاحب یہ حکم آپ دیں گے تو مانیں گے ورنہ نہیں مانیں گے، اللہ ﷻ کی غیر مشروط اطاعت ہے۔ تو رب ماننے کا سارا فلسفہ سامنے آچکا لیکن رب ماننے کا مطلب کیا ہے کہ وہ ہمارا مالک ہے اب وہ جو حکم دے گا وہ ہمیں ماننا ہے یہ اس کا تقاضا ہے اللہ ﷻ کیسے حکم دے گا؟ اللہ ﷻ خود ہر جگہ موجود ہے لیکن اللہ ﷻ کبھی انسانوں کے سامنے نہیں آیا ہے ''رسول ہمارا'' کے ساتھ جو بات میں دہرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ ﷻ خود آ کر کبھی کسی انسان سے بات نہیں کرتا مکہ کے لوگ اسی مزاج کے تھے آج بھی بہت سے ہوں گے کہ اگر اللہ ﷻ مجھے خود کہہ دے کہ یہ کام کرنا ہے تو میں اسی وقت کر دوں گا یا رسول اللہ ﷺ مجھے خواب میں آ کر کوئی بات کہہ دیں تو میری مجال ہے کہ میں نہ کروں، اکثر لوگ فوراً مان لیتے ہیں کہ مجھے خواب میں فلاں بزرگ نظر آ کر یہ کہہ گئے ہیں۔ لہٰذا مجھے تو یہ ماننا ہے لیکن REST ASURE کہ اللہ ﷻ خود کبھی کسی کو آ کر کوئی بات نہیں کہے گا۔ اللہ ﷻ کو تو آج تک کسی نے اس دنیا میں دیکھا ہی نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے یا بے نمازی آدمی یہ سمجھے کہ جب میں نماز پڑھنے لگ جاؤں گا تو اللہ ﷻ نظر آ جائے گا ایسا تو نہیں ہے! حضرت

موسیٰ علیہ السلام کا اللہ ﷻ کے ساتھ وحی کا معاملہ بہت ہی منفرد قسم کا تھا اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی ہوتی تھی ایک دیوار یا پہاڑ کے پیچھے سے آواز آتی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام سوال کرتے تھے جواب آتا تھا۔تو موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی کہ اے اللہ ﷻ آپ اتنے قریب ہیں ذرا سا میرے سامنے آجائیں بس ایک دفعہ میں آپ کا دیدار کرلوں (رب ارنی انظر الیك) لیکن جواب آیا کہ اے موسیٰ اس دنیا میں ان آنکھوں کے ساتھ آپ اللہ ﷻ کا دیدار نہیں کر سکتے ۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ''اللہ ﷻ تو نور ہے اس کو کیسے دیکھا جائے'' یہ 500 واٹ کا بلب ہے اس کو میں نہیں دیکھ سکتا اللہ ﷻ کو کیسے دیکھا جاسکتا ہے۔تو اس دنیا میں کسی پیغمبر نے کسی صحابی نے کسی انسان نے اللہ ﷻ کو نہیں دیکھا ــــــــــــــ رسول اللہ ﷺ معراج پر تشریف لے گئے وہاں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دو رائے ہیں DIVIDED رائے ہیں کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے ہے کہ آپ نے معراج کی رات اللہ ﷻ کا دیدار کیا تھا اور کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ وہاں بھی آپ ﷺ نے اللہ ﷻ کو نہیں دیکھا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی انہیں میں سے ہیں ۔بہر حال اس دنیا میں آج تک کسی نے اللہ کو نہیں دیکھا۔ہم اللہ ﷻ کو اس کے صفاتی ناموں کے حوالے سے پہچانتے ہیں (اسماء الحسنیٰ اللہ کے کچھ نام ہیں) جو اشارہ کرتے ہیں اس کی طرف وہ کوئی خالق ہے مالک ہے اور ہر چیز اسی کی مرضی سے ہو رہی ہے ایک INTEGRATED نظام ہے جو چل رہا ہے۔ایک پورا نظام ہے۔کوئی بچہ پیدا ہوا تو اللہ ﷻ کے حکم سے پیدا ہوا،کوئی فوت ہو گیا اللہ ﷻ کی مرضی سے ہو گیا،کوئی بیمار ہو گیا کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا،تکلیف پہنچ گئی،کوئی خوشی کا موقع آ گیا کوئی غمی کا موقع آ گیا بس ان چیزوں سے ہم اپنے رب کو پہچانتے ہیں ۔وہ خوشی دینے والا ہے،غمی دینے والا ہے، موت دینے والا ہے،نفع دینے والا ہے،نقصان دینے والا ہے،وہ سنتا ہے۔ہم پریشانی میں دعا کرتے ہیں بعض اوقات وہ دعا پوری ہو جاتی ہے ، وہ دیکھتا ہے وہ میرے مسائل حل کرتا ہے میرے دل کی بات جان لیتا ہے ہم بعض اوقات محسوس کر لیتے ہیں ۔تو ہم اس اللہ ﷻ کو اس کے ناموں کے حوالے سے پہچانتے ہیں اس کو کسی نے دیکھا نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ پر جب وحی آتی تھی اور آپ ﷺ مکہ کے لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے تو وہ ایک اعتراض تو یہ کرتے تھے کہ محمد (ﷺ) کی کوئی دنیاوی حیثیت نہیں ہے، یہ کسی قوم کے

سردار نہیں ہیں، ان کی کوئی جا گیر نہیں ہے، کوئی زیادہ STATUS نہیں ہے تو فرشتہ ان کے پاس کیوں آ جاتا ہے اگر اللہ ﷻ کو وحی بھیجنی تھی نبی بنانا تھا تو طائف اور مکے میں بڑے بڑے رؤساء بیٹھے ہیں ان کو نبی کیوں نہیں بنایا۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ چلو ہم مان لیتے ہیں کہ محمد (رسول اللہ ﷺ) کے پاس کوئی فرشتہ آتا ہے اسے چاہیئے کہ کبھی ہمارے پاس آئے کبھی ان کے پاس آئے کچھ باتیں ہمیں بتائے تاکہ پتہ چلے کہ واقعی فرشتہ آتا ہے لیکن ایک ہی آدمی کے پاس آ رہا ہے آ رہا ہے آ رہا ہے ہم کیسے مان لیں؟ گویا کہ یہ اعتراض ان کے ذہن میں تھا کہ ہمارے پاس کیوں نہیں آتا ہے تو اللہ ﷻ ہر انسان کے پاس کبھی نہیں آئے گا نہ پہلے کبھی آیا نہ اب کبھی آئے گا، اللہ ﷻ نے انسانوں میں سے چند انسانوں کو چنا جو بہت باصلاحیت تھے بہت اچھے تھے انسانیت کی کامل معراج پر تھے ان کو چنا کہ یہ اللہ ﷻ کا کلام سن سکتے ہیں سمجھ سکتے ہیں INTERPRET کر سکتے ہیں، ان تک اپنا پیغام پہنچایا اور پھر ان کی ذمہ داری لگائی کہ تم باقی نوعِ انسانی تک پہنچاؤ۔ اللہ نے اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لئے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ابھی پہلے جو بات آئی کہ اللہ ہمارا رب ہے ہمیں ماننا چاہئے کہ اللہ ہمارا مالک ہے اور اس کا منطقی تقاضا ہے کہ اس کا کہنا مانا جائے اور اس کی اطاعت کی جائے اس کے حلت و حرمت کے جو احکام ہیں کہ یہ کرو یہ نہ کرو اوامر و نواہی ہیں ان کو قبول کیا جائے ان کے مطابق زندگی بسر کی جائے اور ساتھ ہم نے یہ بھی سمجھا کہ اللہ خود کبھی نہیں آئے گا اگر آپ کے یا کسی کے ذہن میں ہے کہ اللہ خود مجھے کہہ دے تو میری مجال ہے کہ میں نہ مانوں۔ تو اللہ خود کبھی نہیں آئے گا، اللہ نے نبی اور رسول علیہ السلام بھیجے اور ان میں سے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ پر وہ سلسلۂ رسالت بھی منقطع ہو گیا۔ تو اللہ کا منشا اور مرضی معلوم کرنے کے لئے کہ اللہ کیا حکم دے رہا ہے ہمیں عمومی طور پر نبیوں کو ماننا ہوگا اور بالخصوص محمد رسول اللہ ﷺ کو تسلیم کرنا ہوگا۔ الحمدللہ ہم مسلمان ہیں کلمہ پڑھتے ہیں لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول الله ہم ان باتوں کو گویا کہ تسلیم کر رہے ہیں تو ''رسول ہمارا'' کا ربط آج کے عنوان کے ساتھ یہ ہے وہ پیغام جو اللہ ہم کو دینا چاہتا ہے کہ ایسے زندگی گزارو گے تو تم مجھے پسند آ جاؤ گے وہ اللہ نے اپنے رسول کے ذریعے ہم تک پہنچایا۔ رسول کا ترجمہ MESSENGER ہی ہے یعنی پیغام پہنچانے والا، رسالت کو انگریزی میں MESSAGE (پیغام) کہتے ہیں۔ اور

اللہ تعالیٰ کا وہ MESSAGE جو ہم تک پہنچا ہے وہ یہ قرآن ہے۔تو گویا کہ پہلا عنوان ''رب ہمارا'' دوسرا عنوان ''رسول ہمارا ﷺ'' اور آج کا عنوان'' قرآن ہمارا'' ایک لحاظ سے ایک ہی چیز کے مختلف رخ ہیں اللہ کو اگر ہم نے رب مانا ہے تو اس کا استحضار رکھنا ہوگا کہ وہ ہمارا مالک ہے، وہ ہمیں دیکھ رہا ہے، ہماری باتیں سن رہا ہے جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کے علم میں ہے اور اس کا کہنا ماننا ہوگا حلت وحرمت کہ یہ اس نے کہا ہے کہ کھاؤ اس پر اکتفاء کرنا ہوگا اور اس نے کہا ہے یہ نہ کھاؤ تو رکنا ہوگا چاہے دل مانے یا نہ مانے طبیعت پر جبر کرنا ہوگا اور اللہ کے احکام ہم تک براہ راست نہیں آئے نہ پہلے کسی عام انسان پر نہ آج آئیں گے۔اللہ نے نبی چنے رسول چنے ان تک اپنا پیغام پہنچایا انہوں نے آگے یہ MESSAGE پہنچایا۔ دنیا میں یہ اللہ ﷻ نے جو طریقہ اختیار فرمایا کہ انسانوں میں سے ایک آدمی کو چن لیا جائے اور اس کو MESSAGE دیا جائے اور وہ آگے لوگوں تک پہنچا دے یہ عین فطرت کے مطابق ہے اسی طرح ہوسکتا ہے اس کے علاوہ کسی اور طرح ہو ہی نہیں سکتا۔اس کی ایک مثال یہ ہے پہلے جب بڑے شہروں میں کارپوریشنز ہوتی تھیں اور حکومت نے کہیں لوگوں کسی آبادی کو کوئی MESSAGE دینا ہوتا تھا کہ یہ لوگ یہاں غیر قانونی آباد ہیں یہ جگہ خالی کر دو تو ایک سرکاری اہلکار جاتا ہے اور ایک خط سا اس کے پاس ہوتا ہے اور وہ جا کر اس آبادی کے کسی آدمی سے پوچھتا کہ تمہارا چوھدری کون ہے؟ جی یہ ہمارا بڑا آدمی ہے وہ خط اس کو پڑھا دیتا کہ جناب یہ حکم آیا ہے اور وہ اس کی طرف سے آگے خود سب کو پہنچا دے گا حکومت کا سب کو بتانا ضروری نہیں۔ امریکہ کا صدر بش اگر پاکستان کو کوئی MESSAGE دینا چاہتا ہے تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ وہ ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ بات کرے گا نہیں بلکہ وہ تو مشرف صاحب کی HOTLINE اٹھائے گا جو پہلے سے CONNECTED ہوتی ہے صرف اٹھانا پڑتا ہے اور جو بھی الٹی سیدھی باتیں ہوں گی کہے گا اور شاید جواب کا بھی انتظار نہ کرے اور رکھ دے، اب پورے پاکستان تک کے لوگوں کو یہ پیغام پہنچانا مشرف صاحب کا کام ہے۔ یہ فطری طریقہ ہے اسی طرح دنیا میں ممکن ہے، اب کوئی یہ کہے کہ بش صاحب ہم سے بات کیوں نہیں کرتے تو یہ بیوقوفی کی بات ہے انہونی اور غیر منطقی بات ہے۔تو اللہ ﷻ نے ایسے پیغمبر چنے جن کا کردار اور اخلاق بہت اعلیٰ تھا جن کی شخصیت ایسی کہ کوئی انگلی نہ

اٹھا سکے بے عیب شخصیات اور ان تک اپنا MESSAGE پہنچایا انہوں نے کمال دیانت داری سے لوگوں تک پہنچایا۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو پیغام دینا چاہتے تھے محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ہم تک پہنچا دیا۔ بعض نبی اور بعض رسول علیہم السلام آئے جو دنیا میں زبانی MESSAGE لے کر آئے وہ بھی VALID اور اتنا ہی اہم تھا لیکن جب انسانیت نے آگے ترقی کر لی انسانیت نے آگے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا، کاغذ ایجاد کر لیا، کتابیں ایجاد کر لیں۔ پہلے انسان غار میں رہتا تھا، کھانا پکانا نہیں جانتا تھا، مکان نہیں بنا سکتا تھا، کپڑا نہیں بنا سکتا تھا آہستہ آہستہ (BY HIT AND TRIAL) یہ تجرباتی علوم بڑھتے چلے گئے اسی طرح ایک وقت میں انسان نے زبان ایجاد کر لی لکھنا پڑھنا سیکھ لیا کاغذ ایجاد ہو گیا جب لکھنا سیکھا اور کاغذ ایجاد ہو گیا یہ زیادہ SECURE اور بات کو محفوظ کرنے کا طریقہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے لکھی ہوئی تحریر پیغمبروں کو دے دی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صحائف دیئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی صحیفے دیئے جب انسانوں نے کتابیں بنانا شروع کر دیں تو اللہ تعالیٰ نے کتاب کی شکل میں وحی عطا فرما دی یہ انجیل، زبور، توراۃ اور اس میں آخری کتاب قرآن مجید۔ جو MESSAGE اللہ تعالیٰ ہم انسانوں تک پہنچانا چاہتے تھے کہ جس پر انسان عمل کریں تو وہ میری رضا حاصل کر سکتے ہیں یہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا MESSAGE اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اس MESSAGE کے لانے والے بھی آخری ـــــــــــــ پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اس کو تھامے رکھنا ہو گا اس پر عمل درآمد کرنا ہو گا اس کے مطابق زندگی بسر کرنا ہو گی، یہ صرف ادب اور احترام کرنے کیلئے کتاب نہیں بلکہ یہ تو پڑھنے کیلئے ہے قرآن کا لفظ قَـــــرَاَ سے بنا ہے قرآن کے معنی ہیں وہ کتاب جو بہت زیادہ بار بار پڑھی جائے قرآن مجید وہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اتاری ہی اسی لئے ہے کہ ہم اس قرآن مجید کو بار بار سمجھ کر پڑھیں قرأت کا مفہوم ہے سمجھ کر پڑھنا اور پھر آگے بڑھ کر اس پر عمل کرنا سورۃ بنی اسرائیل آیت 9 میں فرمایا (ان ھٰذالقرآن یھدی للتی ھی اَقْوَم) ''یہ قرآن ہی اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب ہے جو اس راستے کی طرف ہدایت دیتی ہے جو سب سے سیدھا راستہ ہے''۔ اَقُــــوَم کا ترجمہ جو ہم ''سیدھا'' کرتے ہیں یہ اردو زبان کی کمزوری ہی ہے جس وجہ سے یہ ترجمہ کر دیتے ہیں ورنہ آپ اگر سمجھنے کی کوشش کریں تو ہم سورۃ فاتحہ میں جو دعا مانگتے ہیں اھــدنـــا الـصـراط

الـمستقیم ''اے اللہ تو ہمیں صراط مستقیم پر چلا''۔لفظ مستقیم استقامت سے بنا ہے مستقیم کے معنی ہوں گے وہ راستہ جو استقامت چاہتا ہے یعنی اسی پر چلنا ذرا مشکل ہے اور آدمی میں جب تک استقامت نہ ہو اس وقت تک اس پر چل نہیں سکتا تو ایسا راستہ جو آسان نہیں ہے۔استقامت کا جو مفہوم ہمارے ذہن میں ہے وہی عربی میں ہے اس سے اسم فاعل ہے مستقیم وہ راستہ ہے جو استقامت چاہتا ہے آدمی کے اندر ثابت قدمی اور استقلال اور ڈٹے رہنا چاہتا ہے۔اے اللہ ﷻ تو ہمیں اس راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرما اور اسی لئے سورۃ النساء میں اللہ ﷻ نے فرمادیا کہ یہ راستہ آسان نہیں ہے من یطع اللہ والرسول جو اللہ ﷻ اور اس کے رسول کی کامل اطاعت کرے گا کرتا رہے گا اس کو اللہ ﷻ اس صراط مستقیم کی توفیق عطا فرمائیں گے اور اس کو پھر انعام یافتہ لوگوں میں شامل کریں گے۔''قرآن ہمارا'' آج کا موضوع ہے اور پہلے دو موضوعات کا آپس کا ربط اگر معلوم ہو گیا ہو تو آج ہم جہاں کھڑے ہیں وہ مقام ہم متعین کرلیں گے۔اس سے اگلی بات اب میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

قرآن مجید کو سمجھنے کا انداز غور کرنے سے تین طرح کا معلوم ہوتا ہے ایک انداز تو یہ ہے کہ قرآن مجید کتاب ہدایت ہے اور اس قرآن کو کتاب ہدایت ہی کے طور پر لینا چاہئے۔جیسے میں نے عرض کیا کہ عبادت کا لفظ ایک مذہبی اصطلاح ہے ہم عبادت کا لفظ سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہی آتا ہے کہ اشراق، تہجد، تسبیح وغیرہ قسم کے کام عبادات ہیں اور صحیح مفہوم ذرا پیچھے ہو جاتا ہے غور کیا جائے تو سامنے آجاتا ہے۔اسی طرح ہدایت کا لفظ بھی عربی زبان کا لفظ ہے جو ہم بولتے رہتے ہیں اے اللہ ﷻ تو ہدایت دے۔اس کا جو صحیح مفہوم (CONNOTATION) ہے اس کی طرف توجہ کم جاتی ہے۔انگریزی میں ہدایت کو GUIDANCE کہتے ہیں۔انسان کم عمر ہو تو GUIDANCE کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے لیکن جب بڑا ہو جاتا ہے اور تعلیم حاصل کرلیتا ہے MBA ہو جاتا ہے اس وقت بھی JOB کے لئے والد سے یا کسی بڑے سے مشورہ کرنا پڑتا ہے کہ کہاں JOB کروں کیسے درخواست دوں حالانکہ وہ خود پڑھا لکھا نوجوان ہے بہت کچھ واقفیت اسے حاصل ہے اس کے باوجود اسے کسی کی GUIDANCE کی ضرورت ہوتی ہے۔جب پڑا لکھا شخص دنیاوی اعتبار سے بھی GUIDANCE کا محتاج ہے تو جو کم پڑھا لکھا ہے وہ تو زیادہ

GUIDANCE کامحتاج ہوگا اور آخرت کے معاملے میں تو اور زیادہ شدید ضرورت ہوگی۔

قرآن مجید کو الہدی کہا گیا ہے اور یہی بات انسان کو بالکل آغاز سے سمجھا دی گئی قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا ذکر ہے جو کہ پہلے انسان اور ہمارے جدامجد ہیں ان کی تخلیق کے کئی مراحل ہیں فرشتوں کے سامنے پیشی ہوئی، سجدہ کروایا گیا، جنت میں رکھا گیا اور اللہ ﷻ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگئی وہاں سے دنیا میں بھیج دیا گیا۔قرآن مجید میں جہاں دنیا میں بھیجے جانا کا ذکر آیا ہے وہاں ذکر ہے کہ اے آدم ہم آپ کو دنیا میں ایک معین مدت تک رہنے کیلئے بھیج رہے ہیں وہاں تمہیں کھانے پینے اور لباس وغیر کے متعلق GUIDANCE کی ضرورت پڑے گی۔

سورۃ البقرۃ میں فرمایا(فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای)یعنی اے آدم! دنیا میں جب کبھی تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے گی (یعنی پیغمبر آئیں گے جن کا کردار بہت اعلی ہوگا انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ہوگا لہٰذا توقع ہوگی کہ وہ یہ بات بھی جھوٹی نہیں کہیں گے کہ اللہ ﷻ نے ہمیں اپنا پیغام دے کر بھیجا ہے جو ہم تم تک پہنچا رہے ہیں) تو جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا (یعنی وہ پیغام لے کر گھر رکھ لینے کے لئے نہیں ہوگا۔ اس کی اتباع کرنا ہوگی)(فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون)اس کا نتیجہ ہوگا کہ تو کامیاب ہو جائے گا۔اللہ ﷻ راضی ہو جائے گا اور جو اس کی خلاف ورزی کرے گا ان کے بارے میں فرمایا(والذین کفروا و کذبوا باٰیتنا)جو ہماری بات کا انکار کرے گا اور تکذیب کرے گا۔تکذیب کا مفہوم بھی سمجھئے کہ ایک ہے کِذْب یعنی جھوٹ بولنا، میں اور آپ کوئی بات کرتے ہیں۔اس میں امکان ہے کہ وہ واقعہ کے خلاف ہو لہٰذا کوئی کہہ سکتا ہے کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔لیکن رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ایسا کہہ دینا نعوذ باللہ کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں یہ کتنی بڑی بات ہے۔آپ نے تو کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں۔تو تکذیب کا معنی یہ ہے کہ کوئی آدمی بات کر رہا ہے اور اسے کہہ دیں کہ آپ تو ایسے ہی بات کر رہے ہیں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔تو فرمایا جو تکذیب کرے گا یعنی جو محمد رسول اللہ ﷺ زندگی کے متعلق ہدایت لے کر آئے ہیں ان کے بارے میں ایسے کہنا کہ یہ تو ایسے ہی کہتے رہتے ہیں یہ محمد ﷺ کی تکذیب ہے۔آپ ﷺ ایسے انسان ہیں جنہوں نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں جو ان کو کہے کہ معاذ اللہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں وہ خود

جھوٹا ہے۔ والذین کفرو وکذبوا باٰیتنا اولٰئك اصحاب النار جو انکار کردے گا اور ہماری آیتوں کو جھٹلا دے گا وہ دوزخ والے میں سے ہے۔

یہ قرآن ہدایت ہے جو انسانوں کے پاس اللہ ﷻ کے رسول محمد ﷺ لے کر آئے ہیں اس سے پہلے اللہ ﷻ نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی جس کے بارے میں فرمایا (انا انزلنا التورٰة فیها هدی ونور) ''ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو تورات عطا فرمائی جس میں ہدایت اور نور تھا'' تورات کو ''هُدًی'' فرمایا یعنی نکرہ لفظ لائے اور انجیل کے بارے میں بھی اسی طرح فرمایا لیکن جب قرآن کی باری آئی تو اللہ ﷻ نے فرمایا (هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ) وہ اللہ ﷻ خالقِ کائنات ہی ہے جس نے اپنا خاص رسول ﷺ ''الھدیٰ'' دے کر بھیجا۔ PROPER NOUN خاص ہدایت، آخری ہدایت، مکمل ہدایت GUIDANCE (ودین الحق) ''اور یہ دینِ حق دے کر بھیجا''۔ الہدیٰ اور دین الحق دونوں سے مراد قرآن ہے۔

اب قرآن سے پوچھنا ہوگا کہ اس کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ اس قرآن کا جو ہمارے ذہن میں نقشہ ہے وہ یہ کہ اس قرآن کا ادب کرتے ہیں، احترام کرتے ہیں، اونچا رکھتے ہیں کہ بے ادبی نہ ہو جائے لیکن اس پر عمل نہیں کرتے، اللہ ﷻ نے ہمیں ہدایت (قرآن) عطا فرمائی ہے اس کے کچھ حقوق متعین ہوں گے وہ آپ میں سے اکثر حضرات جانتے ہیں کہ اس کو سیکھنا، پڑھنا اور اس کا علم حاصل کرنا، اس کی زبان سیکھنا، اس پر عمل کرنا ہے اور اس کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ اب ختم نبوت کے بعد تو یہ لازمی تقاضا ہے جب تک پہلے سیکھیں گے نہیں تو آگے اس پر پورا عمل درآمد ہو کیسے سکتا ہے اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا اس حدیث میں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ویسے تو حضرت علی اور کئی صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے بڑی مشہور حدیث ہے مختلف طریقوں سے اکثر حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ خیر کم من تعلم القرآن وعلمه ''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں'' اگر یہ قرآن اللہ ﷻ کا ہمارے نام MESSAGE ہے اور اس پر عمل درآمد کرنے سے اس کی ناراضگی اور رضا کا فیصلہ ہونا ہے تو یہ بہت اہم ہے۔ اس کو پہلے سیکھنا ہوگا انسانوں میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو اس قرآن کو سیکھیں اور دوسروں کو بھی سکھائیں۔ ہم سب نماز پڑھتے ہیں جب ہم نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھتے ہیں فقہ حنفی

کے مطابق روزانہ پانچ وقت نمازوں کی 48 رکعتیں ہوتی ہیں اور 48 رکعتوں میں 48 دفعہ سورۃ فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔امام پڑھے یا خود پڑھے، فقہ حنفی میں امام کی طرف سے پڑھا مقتدی کے لئے کافی ہے، اگر خود نماز پڑھو تو ہر رکعت میں ویسے ہی پڑھنی پڑے گی، 48 مرتبہ سورۃ فاتحہ میں ہم کہتے ہیں (اھدنا الصراط المستقیم)''اے اللہ تو ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما'' یہ ہدایت کیا ہے؟ اس کو سمجھئے قرآن ہدایت ہے توراۃ ہدایت تھی اب فائنل ہدایت قرآن ہے لیکن اس قرآن سے کوئی چیز حاصل کر لینے کو ہدایت کہتے ہیں قرآن میں تو کوئی چیز ہے جو مجھ تک CONVEY (منتقل) ہو جائے گی تو وہ ہدایت کہلائے گی اور میں کہہ سکوں گا کہ مجھے ہدایت مل گئی، تو ہم اللہ ﷻ سے دعا کرتے ہیں اور مانگتے ہیں کہ اے اللہ ﷻ ہمیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت عطا فرما۔

عام طور پر مفسرین نے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں ہدایت کے تین درجے لکھے ہیں۔ ہدایت کے معنی GUIDE کرنا کے ہیں مثلاً آپ میں سے کوئی آدمی کہیں کسی جگہ پر کھڑا ہے اور کوئی دوسرا شخص آ کر راستہ پوچھتا ہے کہ فلاں صاحب کا مکان کہاں ہے؟ ایک انداز ہے کہ آپ اس کو وہی کھڑے کھڑے کچھ GUIDE کریں یہ گلی چلے جائیں دائیں مڑیں بائیں مڑیں یہ نشانی والا مکان ان کا ہے اس سے بہتر درجہ ہے کہ آپ اس کو تھوڑی دور ساتھ لے جائیں اور جہاں سے وہ مکان نظر آ جائے آپ بتا دیں کہ وہ مکان ہے۔جی وہاں چلے جائیں اور سب سے اعلی درجہ یہ ہے کہ اس کو ساتھ لیں اور کہیں آؤ میرے ساتھ، میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں اور جہاں وہ گھر ہے وہاں اس کے دروازے پر اتار کر BELL بجا کر آدمی کو باہر بلا کر بتا دیں کہ یہ صاحب ہیں جی ان سے بات کریں ہدایت کا یہ اعلی ترین درجہ ہے۔ہم اللہ ﷻ سے ہدایت کی جو دعا کرتے ہیں اس میں یہ تینوں درجے مراد ہوتے ہیں اسی لئے ترجمہ کیا جاتا ہے 'اے اللہ ﷻ تو ہمیں سیدھا راستہ سجھا' پہلے سمجھ تو آئے کہ سیدھا راستہ ہے کیا؟ 'پھر اس راستے پر چلا' جب تک ارادہ اور کوشش اور اپنے پروگراموں کو آگے پیچھے نہ کیا جائے اس وقت آدمی نہیں چل سکتا چلنے کا فیصلہ کرنا۔اب یہ سات روزہ پروگرام ہو رہا ہے۔ پانچ ہزار آدمیوں کو اس کی اطلاع کی گئی ہوگی اور ایک ہزار نے تو لازماً سوچا ہوگا کہ جانا چاہئے بڑا اچھا پروگرام ہے لیکن چار پانچ سو آدمی آ رہے ہیں باقی سوچتے

ہی رہے کہ جانا چاہئے۔ تو کسی چیز کا سمجھ لینا ایک درجہ ہے اور اس پر چلنا دوسرا درجہ ہے اس میں محنت درکار ہے اور پھر چلتے رہنا چلتے رہنا چلتے رہنا کہ منزل تک پہنچ جائے یہ بھی کوئی آسان کام نہیں۔ کتنے ہی ہیں جنہوں نے آغاز میں فیصلہ کیا ہوگا کہ میں نے ساتوں دن یہ پروگرام ATTEND کرنا ہے لیکن ساتوں دن ATTEND کرنے والے بہت کم ہیں کوئی نہ کوئی کام پڑ جاتا ہے یہ اللہ ﷻ کی توفیق سے ہوتا ہے رکاوٹیں اور HURDLES آتی ہیں ان کو ہٹا یا نہ جائے فیصلہ نہ ہو مصمم ارادہ نہ ہو تو کام نہیں ہوسکتا؛ اسی لئے قرآن مجید میں یہ تینوں درجے، ہم مراد لیتے ہیں۔ ــــــــــــــ اور جو لوگ یہاں ہدایت حاصل کریں گے، نیک عمل کر کے اچھی زندگی گزاریں گے، ایمان پر موت آجائے گی پھر قیامت کے دن زندہ ہوں گے حساب کتاب ہوگا اللہ ﷻ ان سے اچھا سلوک کرے گا، آرام وسکون (VIP TREATMENT) کے ساتھ جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے سورۃ اعراف میں ذکر ہے کہ جب وہ جنت میں پہنچ جائیں گے وہاں دعا کریں گے (الحمدلله الذی هدنا لهٰذا وما کنا لنهتدی لولا ان هدانا الله) اس اللہ ﷻ کا شکر ہے کہ جس نے ہمیں یہاں تک پہنچنے کی ہدایت عطا فرمائی' ہدایت کا لفظ ہے گویا کہ اس اللہ ﷻ نے ہمیں وہ راستہ سجھایا بھی تھا، اس پر چلایا بھی تھا ممکن بھی بنایا ساری رکاوٹیں دور کر دیں اور ہوتے ہوتے یہاں جنت میں پہنچا بھی دیا، یہ ہدایت کا آخری درجہ ہے، ہم اللہ ﷻ سے یہ تینوں درجے مانگتے ہیں ہمارے ذہن میں یہ رہنا چاہئے کہ جب ہم اللہ ﷻ سے مانگ رہے ہیں تو اعلیٰ درجے میں چیز مانگے اور اگر ہمارا اپنا تصور صحیح ہے تو پھر اللہ ﷻ سے صحیح بات مانگیں گے اور پھر جیسا کوئی مانگتا ہے اللہ ﷻ اسی طرح کی چیز دیدیتے ہیں ایک چیز ہمارے تصور میں ہی نہیں ہے تو وہ کیسے مل جائے گی ہدایت کو ایک اور پہلو سے دیکھیں اس سے کچھ اور پہلو سمجھ میں آئیں گے۔ آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ ہم انسان ہیں الحمدللہ۔ ایک ہمارا ظاہری وجود ہے (یہ شکل وصورت VOLUME، قد کاٹھ، دوڈھائی تین من وزن) لیکن انسان صرف اس کو نہیں کہتے بلکہ انسان کے اندر ایک جان ہے جان نکل جائے تو باقی کچھ بھی نہیں رہتا اور اس جان کے اندر ایک اور چیز ہے جو روح کہلاتی ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ وہ روح اگر ختم ہوجائے تو بظاہر آدمی زندہ ہوتا ہے چلتا پھرتا ہے کھاتا پیتا ہے لیکن وہ انسان نہیں رہتا وہ حیوان ہوجاتا ہے،

ابوجہل ایک شخص تھا اس کی روح اسی دنیا میں مردہ ہو چکی تھی محمد رسول اللہ ﷺ کا MESSAGE اس تک پہنچا اور اس نے جان بوجھ کر انکار کر دیا ایک دفعہ سمجھایا دو دفعہ سمجھایا دس دفعہ سمجھایا نہیں مانا اور انکار کر دیا اس کے اندر کا انسان مر گیا لہٰذا وہ کاروبار کرتا تھا، اٹھتا بیٹھتا تھا، لوگوں سے ملتا تھا بہت اچھا WORDILY WISE تھا قوم کا سردار تھا لیکن قرآن کے اعتبار سے اس کے اندر کا انسان مر چکا تھا قرآن کہتا ہے کہ سورۃ الاعراف میں (اولٰئك كالانعام بل هم اضلّ) یہ لوگ تو جانور ہیں ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن دوسری جگہ کہتا ہے کہ (انك لاتسمع الموتى) (اے نبی ﷺ یہ لوگ چلتی پھرتی لاشیں ہیں) آپ ان مردوں کو نہیں سنا سکتے آپ تو ان کو سنائیں گے جن کے اندر کا انسان زندہ ہے جیسے علامہ اقبال نے کہا ہے۔

ع اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

انسان اپنے اندر کبھی غور کرے تو ہر انسان کے اندر ایک اور انسان ہے، ایک ضمیر ہے ایک نیکی بدی کی تمیز ہے، ہر انسان کی فطرت ہے عورت ہو یا مرد، چینی ہو یا جاپانی، عربی ہو یا عجمی، لوکل ہو یا مہاجر۔ انسان جب بالغ ہوتا ہے اس کے اندر سے ایک آواز آتی ہے کہ یہ کام اچھے ہیں کرنے چاہئیں اور یہ کام برے ہیں نہیں کرنے چاہئیں اور اچھے کام کرے تو اندر سے کوئی چیز شاباش دیتی ہے اور برے کام کرے تو اندر سے وہ چیز کاٹتی ہے۔ آدمی GUILTY FEEL CONSCIENCE کرتا ہے یہ جو انسان کے اندر MORALITY ہے اور MORAL LAW ہے یہ اصل انسان ہونے کی نشانی ہے۔ روح کو ہم نے نہیں دیکھا جیسے اللہ ﷻ کو نہیں دیکھا فرشتوں کو نہیں دیکھا اس طرح کچھ کائنات کی UNSEEN حقیقتیں ہیں جن میں سے ایک روح بھی ہے جس کو ہم نہیں دیکھ سکتے لیکن FEEL کر سکتے ہیں اگر وہ روح ہے تو انسان کے اندر MORALITY ہوگی اور اگر وہ روح مردہ ہو جائے تو یہ MORALITY ختم ہو جاتی ہے MORALITY اور روح کو ہم اردو میں ''ضمیر'' بولتے ہیں مثلاً فلاں آدمی بڑا باضمیر قسم کا آدمی ہے الیکشن میں یہ لفظ بہت استعمال ہوتا ہے چاہے کھڑا ہونے والا کیسا ہی آدمی ہو اور عہدہ دار بن کے چاہے سارا پیسہ کھا جائے۔ جب الیکشن کے دن آتے ہیں لوگ کہتے ہیں بڑا باضمیر آدمی ہے، نہ بکنے والا، نہ جھکنے والا معلوم ہوا کہ ضمیر نام کی کوئی چیز ہے اور ہم ہی یہ لفظ

بولتے ہیں کہ جی فلاں آدمی بڑا بے ضمیر آدمی ہے یعنی اس کے اندر کا انسان مر چکا ہے کوئی VALUES ہی نہیں، حلال حرام یا صحیح غلط کا کوئی فرق نہیں بس جو آیا ٹھیک ہے ایسا آدمی بے ضمیر انسان ہے۔اسی کو قرآن کہہ رہا ہے کہ اس کے اندر کا انسان مر جاتا ہے۔سورۃ الاعراف میں اسی کو کہا گیا کہ کتنے ہی انسان ہیں ان کی آنکھیں ہیں ان کے کان ہیں لیکن وہ اُن سے ایسے کام نہیں لیتے ہی جیسے کام انسان لیتے ہیں، دل ہے لیکن اس سے انسانوں کی طرح وہ کام نہیں لیتے، بکری کا بھی دل ہے اور دوسرے جانوروں کا بھی دل ہے بکری بھی دیکھتی ہے لیکن انسان بکری کی طرح دیکھے تو وہ انسان نہیں حیوان ہے۔ ہدایت کا تعلق اسی روح کے ساتھ ہے روح صحیح ہوگی تو جب اس کو اللہ ﷻ کا پیغام پہنچے گا تو اسکے اثرات ہمارے جسم پر پڑیں گے نماز اور روزہ، نیکی اور بدی کی تمیز اس میں پیدا ہو جائے گی اور اگر وہ روح ہی نہیں ہے تو انسان بے ضمیر ہو چکا ہے تو پھر ہدایت کہاں سے آئے گی۔قرآن مجید میں کئی سردارانِ قریش کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ آپ کی محفل میں آتے ہیں آپ سمجھتے ہیں کہ وہ بڑی غور سے سن رہے ہیں اے نبی کریم ﷺ کیا آپ اندھوں کو دکھا سکتے ہیں؟ اور گونگوں کو سنا سکتے ہیں؟ نہیں سنا سکتے یہ تو بہرے ہیں یہ تو سننا نہیں چاہتے یہ سب دکھانے کے لئے کر رہے ہیں تو جس کے اندر کا انسان زندہ ہے وہ قرآن کی بات کو اللہ ﷻ کا MESSAGE سمجھے گا اور جس کے اندر کا انسان کسی وجہ سے مردہ ہو چکا ہے قرآن کی بات اس کی سمجھ میں ہی نہیں آئے گی یہ بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہوگی آپ سارا قرآن سنا دیں اس کو کچھ اثر نہیں ہوگا۔ہاں جس کے درمیان درمیان میں بات ہوگی اس کے لئے محنت کرنا ہوگی اور یہ بات حقیقت ہے کہ اکثر لوگ درمیان درمیان میں ہیں۔ایسے لوگ کم ہیں جن کی روح مکمل طور پر زندہ اور ضمیر روشن ہو اور ایسے بھی بہت کم ہیں جن کا ضمیر بالکل مردہ ہو اور یہ اللہ ﷻ نے ہمارا بھرم رکھا ہوا ہے کہ میں آپ کے بارے میں نہیں جانتا اور آپ میرے بارے میں نہیں جانتے ضمیر کس حال میں ہے یہ معاملہ DIRECT اللہ ﷻ کے ساتھ ہے کس کا ضمیر کس درجہ میں ہے یہ صرف اللہ ﷻ کو معلوم ہے۔لہٰذا قرآن مجید میں ہے کہ اے نبی آپ ہدایت کا فیصلہ نہیں فرمائیں گے اللہ ﷻ فرمائے گا (اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِیْ مَنْ يَّشَآءُ) اور آپ جس سے محبت کریں اسے ہدایت نہیں دیں گے بلکہ آپ کوشش

کریں گے دومرتبہ چار مرتبہ توجہ دلائیں گے لیکن ہدایت کا فیصلہ اللہ ﷻ فرمائے گا۔حضور اکرم ﷺ نے دو آدمیوں کے نام لے کر دعا کی تھی ظاہراً دونوں بڑے ACTIVIST تھے، بڑے محنتی بھاگ دوڑ کرنے والے EXTROVERT قسم کے آدمی تھے۔اے اللہ عمر بن خطاب اور عمرو بن ہشام ان دونوں میں سے کسی ایک کو اسلام کی توفیق دیدے اللہ ﷻ دونوں کو دے سکتا تھا اللہ ﷻ کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا لیکن ایک کو توفیق مل گئی ایک کو نہیں ملی آپ خود سوچیں عمرو بن ہشام کو کیوں نہیں ملی اور عمر بن الخطاب کو مل گئی حالانکہ دعا کرتے وقت دونوں ہی کفر میں تھے اسلام کے مخالف تھے، اللہ ﷻ نے کوئی ٹاس کر کے فیصلہ تو نہیں کیا ہوگا کہ عمرو بن ہشام کو ہدایت دیں یا عمر بن خطاب کو۔ اللہ ﷻ نے دل کی کیفیت دیکھی اس کے اندر کا انسان (ضمیر) زندہ روحانی کیفیات اور MORALITY بہت اعلیٰ تھی اور دوسرے کے اندر ضمیر مر چکا تھا لہٰذا اللہ ﷻ نے کہا عمر بن خطاب قبول ہے اور دوسرا نہیں۔

قرآن سے ہدایت حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جانے کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ آپ اور میں دیکھیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں ہمارا وہ ریسیونگ سیٹ ہے کہ نہیں اگر ہمارا اپنا ہی ریسیونگ سیٹ خراب ہو تو قرآن مجید سے لاکھ ٹرانسمیشنز ہو رہی ہوں ہمارے تک تو نہیں پہنچیں گی اب یہ مسجد ہے اللہ ﷻ کا گھر ہے مقدس جگہ ہے لیکن دنیا کے ہزاروں ٹی وی اسٹیشنز اور ہزاروں ریڈیو سٹیشنز کی لہریں یہاں بھی موجود ہیں حتیٰ کہ اب WIRELESS انٹرنیٹ ہے کسی کی دیکھنے والی آنکھیں ہوں تو وہ آدمی کہے گا کہ ابھی بہت گندی تصویر ادھر سے ادھر جا رہی تھی۔۔اگر ایک کمپیوٹر یہاں لگا دیں گے تو وہ چیز سامنے آ جائے گی، ریڈیو آن کر دیں دنیا کا کوئی ریڈیو سٹیشن تو وہ وہاں کی آواز سنائے گا۔ تو اسی طرح قرآن مجید اپنی جگہ کتابِ ہدایت ہے جس سے RADIATIONS ہو رہی ہیں ہدایت پھوٹ رہی ہے لیکن اگر آپ کا اور میرا ریسیونگ سیٹ ہی خراب ہو، روح ہی مردہ ہو تو ہدایت کہاں سے حاصل کریں گے ہر آدمی کو غور کرنا ہوگا کہ قرآن ہمارا تب بن سکتا ہے اگر ہمارے اندر کا انسان زندہ ہے ورنہ یہ قرآن ہمارا ہوگا ہی نہیں ہم اس کو پہچانیں گے ہی نہیں ہر آدمی دیکھے اپنے گریبان میں۔اور حضور ﷺ نے فرمایا (اذا لم تستحی فاصنع بما شئت) جب کسی کا ضمیر مردہ ہو جائے تو اب وہ شخص بے حیا ہو گیا ہے جو چاہے

کرے کپڑے اتار کر بازار میں پھرتا رہے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ آپ غور فرمائیں نہیں تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ''حیا'' کا لفظ حیات سے بنا ہے اور مطلب یہ کہ جس میں حیا ہے اس کے اندر کا انسان زندہ ہے اور جس آدمی میں حیا نہیں ہے اس کے اندر کا انسان مر چکا ہے اب یہ فیصلہ میں اور آپ ایک دوسرے کے بارے میں نہیں کر سکتے اپنے بارے میں کر سکتے ہیں کہ میرا شرم وحیا کا معاملہ MORALITY سال پہلے کہاں تھا اب کہاں ہے ہم اپنے بارے میں کہہ سکتے ہیں اگر شرم وحیا ختم ہو رہی ہے تو وہ اندر کا انسان مر رہا ہے اور اگر حیا بالکل ختم ہو جائے تو پھر اندر کا انسان یقین رکھیں بالکل ہی مر گیا اور یہ بات بطور انفارمیشن کے ہی سامنے رکھ لیں ہماری کمزوری یہ ہے کہ میں آپ کو دیکھتا ہوں تو میں اکثر وبیشتر خیال کروں گا کہ یہ آدمی میری طرح سوچتا ہوگا میری طرح اس کے گھر بار، رہائش اور معاملات ہوں گے۔ آپ مجھے دیکھتے ہیں تو آپ اپنے طور پر یہ سوچتے ہوں گے کہ یہ آدمی بھی میری طرح کا ہے ہم مغرب کے لوگوں کو دیکھتے ہیں کسی امریکن کو کسی یورپین کو کسی وہاں کے گوری چمڑی والے کو دیکھتے ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بھی انسان ہیں اور ہماری طرح صبح اٹھ کر منہ دھوتے ہوں گے طہارت کرتے ہوں گے کلی کرتے ہوں گے، ناک میں پانی ڈالتے ہوں گے استنجا کرتے ہوں گے، حالانکہ وہ ایسا نہیں کرتے وہ تو مہینوں طہارت کے لئے پانی استعمال نہیں کرتے وہاں تو MORALITY ہی نہیں ہے اور جو بات اصل میں بتانے جا رہا ہوں کہ آج سے پچاس سال پہلے شاید یورپ امریکہ اور برطانیہ میں کچھ لوگ ایسے ہوں جن کے ہاں MORALITY تھی، کوئی اخلاقی VALUES تھیں اور 60ء کے بعد انہوں نے MORALLESS معاشرہ بنا دیا MORALITY کو نکال دیا وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک رکاوٹ ہے یہ مولوی اور دیندار قسم کے لوگ ایسے ہی کہتے ہیں کہ یہ چیز حلال ہے یہ چیز حرام ہے اتنا لباس ہونا چاہئے یہ کام کرنا چاہئے یہ نہیں کرنا چاہئے سب رکاوٹیں ہیں ان کو نکال دو MORALITY ختم کر دو نتیجتاً یورپین اور امریکن سوسائٹی آج VALUELESS سوسائٹی بن چکی ہے IMMORAL سوسائٹی ہے ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری طرح ہی ہیں لیکن ان کے اندر کچھ نہیں ہے وہاں تو MORALITY نام کی چیز ختم ہو چکی ہے۔

جب MORALITY ختم ہو جائے تو دو نتیجے نکلتے ہیں کہ پہلے شرم وحیا ختم ہو جاتی

ہے دوسرے درجے میں رشتوں کی تمیز ختم ہوجاتی ہے سادہ لفظوں میں انسان حیوان بن جاتا ہے جانوروں میں کوئی لباس نہیں ہوتا کوئی حیا نہیں ہوتی اور رشتوں کی کوئی تمیز بھی نہیں ہوتی صرف بچپن میں بھینس گائے وغیرہ اپنے بچے کی اور مرغی اپنے چوزہ کی ماں کی طرح حفاظت کرتی ہے اس کو خطرات سے بچاتی ہے لیکن جب وہ بڑا ہوجاتا ہے جانوروں کو تو احساس نہیں ہوتا کہ یہ میرا بیٹا ہے، یہ بہن ہے، یہ بیٹی ہے، یہ انسانوں میں رشتوں کی تمیز اس روح کی وجہ سے ہے مغرب میں یہ رشتے ختم ہوچکے ہیں MORALITY ختم ہوکر وہ جانوروں کی سطح پر گر چکے ہیں ــــــــــــ اگر ہم قرآن سے استفادہ کرنے کے خواہشمند ہیں قرآن کو سینے سے لگانے کے خواہشمند ہیں تو ہمیں پہلے انسان بننا ہوگا اور اگر ہم پہلے سے انسان ہیں جیسا کہ اللہ ﷻ نے ہمیں بنایا ہے اگر ہماری روح زندہ ہے تو مبارک باد بہت اچھی بات ہے! آپ قرآن پڑھیں آپ کو اپنی دل کی آواز محسوس ہوگی کہ قرآن بھی وہی بات کہتا ہے کہ جو میرا دل کہہ رہا ہے فوراً قبول کرے گا۔ امریکہ میں کچھ لوگ آج بھی لاکھ میں ایک ہی سہی موجود ہیں۔ لیکن اگر اندر کا انسان مر چکا تو پھر قرآن کی بات سمجھ میں ہی نہیں آئے گی اور اگر درمیان میں کہیں کھڑے ہیں اور کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اچھا کام کرنا چاہئے یہ کوئی زندگی نہیں ہے کہ آدمی بے حیائی کرتا رہے تو سمجھئے کہ ابھی کچھ رمق باقی ہے ابھی ضمیر بالکل مرا نہیں ہے کوشش کریں محنت کریں قرآن پڑھیں قرآن خود کہتا ہے کہ ایسے لوگ قرآن کی طرف آئیں قرآن کو سیکھیں سمجھیں اور عمل کرنا شروع کردیں اللہ ﷻ ان کیدلوں میں بھی ایمان پیدا کردے گا۔ (قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا) عمل کرتے رہو قرآن پڑھتے رہو اللہ ﷻ ضمیر زندہ کردے گا۔ تو ''قرآن ہمارا'' بنانے کے لئے اپنے اندر دیکھیں کہ ہمارا اندر کس حال میں ہے۔ روح زندہ ہے MORALITY ہے کہ نہیں ہے اور اس کی نشانی یہ ہے کہ شرم وحیا ہے کہ نہیں آج کے معاشرہ میں ضمیر کی جڑیں کاٹی جارہی ہیں مغرب میں تو یہ بالکل ختم ہوچکی ہے یہاں ابھی کچھ اثرات باقی ہیں اس کو بھی ختم کرکے انسانوں کو حیوان بنارہے ہیں وہ جیسے علامہ اقبال نے کہا تھا کہ

ہوفکر اگر خام تو آزادیٔ افکار

انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

ہدایت تو ملتی ہے اگر روح زندہ ہو اور اگر روح بالفرض کسی کی مردہ ہو چکی ہو تو قرآن سے بھی ہدایت مل نہیں سکتی خود قرآن کہتا ہے کہ (یُضِلّ بِہٖ کَثِیرًا وَیَھْدِی بِہٖ کَثِیرًا)'' اللہ ﷻ اسی قرآن کے ذریعے بہت ساروں کو ہدایت دے دیتا ہے'' جن کی روح زندہ ہے اور جن کے اندر کا انسان مر چکا ہے وہ قرآن سے بھی ہدایت حاصل نہیں کر سکتے ۔قرآن نے خود سورۃ الاعراف میں مثال دی ہے کہ جیسے بارش ہوتی ہے پانی ایک ہی ہے اچھی زمین، FERTILE زمین پر بارش ہوتی ہے تو اچھی چیزیں اگتی ہیں گندگی اور کچرے پر بارش ہوتی ہے گندی چیزیں اگتی ہیں اسی طرح جس کے اندر کا انسان زندہ ہے وہ قرآن پڑھے گا تو اس کے اندر بھلائی ،خیر، خدمت خلق کا جذبہ پیدا ہوگا اور جس کے اندر کا انسان مر چکا ہے وہ اس کو پڑھے گا تو سمجھے گا نہیں اور دور ہو جائے گا اس کی شخصیت اس کے کردار اور اس کے اعمال میں اور ہی چیز آئیگی۔ ایک تیسرے حوالے سے بھی قرآن کی بات کو سمجھیں گے تو سمجھ آ جائیگی ویسے تو آپ کے علم میں ہے میں مختصراً آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں کہ ہماری انسانی زندگی ویسے تو ایک وحدت ہے اس کو دو حصوں میں DIVIDE نہیں کیا جا سکتا لیکن سمجھنے کیلئے بہرحال CLASSIFICATION ہر جگہ ہوتی ہے سمجھنے کے لئے انسانی زندگی کے دو بڑے بڑے حصے ہیں ایک ہے انفرادی زندگی اور دوسری ہے اجتماعی زندگی ۔قرآن تو انسان کو ایک وحدت ہی سمجھتا ہے اور قرآن کی ہدایت انفرادی زندگی کے بارے میں بھی ہے اور اجتماعی زندگی کے بارے میں بھی ،لیکن ہماری کمزوری یہ ہے کہ کچھ عرصے سے حالات اور دیگر اثرات کی وجہ سے ہم اجتماعی زندگی کو بھول گئے ہیں انفرادی زندگی کو زیادہ توجہ دیتے ہیں کیونکہ وہ سامنے ہی ہے اور خاص طور پر دنیا کے اسلام کے علاوہ جو دوسرے مذاہب ہیں وہ سارا زور ہی انفرادی زندگی پر دیتے ہیں لہٰذا ہمارے ذہنوں میں بھی یہی بات بیٹھ گئی ہے کہ دین کا مطلب ہے کہ انفرادی زندگی کی اصلاح اور انفرادی عبادات، اللہ ﷻ سے ذاتی لو لگانا یہی دین کا تقاضا ہے اور یہ ہو جائے تو کام ختم ہو گیا کاروبار جیسا کیسا چل رہا ہے اللہ ﷻ معاف کرے گا بس ٹھیک ہے ذاتی معاملات کی حد تک آدمی کو ٹھیک ہونا چاہئے جبکہ

قرآن یہ کہتا ہے کہ نہیں ذاتی معاملات بھی تب ٹھیک ہو سکتے ہیں جب اجتماعی معاملات ٹھیک ہوں گے پہلے ذہن میں خانہ ہونا چاہئے کہ اجتماعی زندگی بھی کوئی زندگی ہے اور پھر اس میں بھی کوشش ہو پوری کامیابی نہ بھی ہو سکے لیکن کوشش تو ہو کوئی ذہن میں نقشہ موجود ہونا چاہئے رسول اللہ ﷺ نے یہی بات قرآن سے اخذ کی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سمجھائی ، رسول اللہ ﷺ کی زندگی بھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی بھی انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر قرآن کے تابع تھی ۔انفرادی زندگی میں قرآن لانا ہو تو قرآن پڑھنا پڑے گا اس پر عمل کرنا ہوگا پوری زندگی کے انفرادی معاملات قرآن کے تابع کرنا پڑیں گے اور اجتماعی زندگی میں قرآن لانا ہو تو اجتماعی زندگی کے جو گوشے ہیں سماجی، معاشی اور معاشرتی معاملات یہ سارے قرآن کے تابع کرنا پڑیں گے۔

جب تک کوئی علاقہ نہ ہو کوئی TERRITORY نہ ہو اس وقت تک اجتماعی معاملات ٹھیک نہیں ہو سکتے محمد رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے احکام نافذ کرنے کے لئے ایک علاقہ فتح کیا جنگ بدر، جنگ احد ، جنگ خندق، صلح حدیبیہ اور فتح مکہ جنگیں لڑ کے عرب کی سرزمین کو فتح کیا (علاقہ فتح کرنے کیلئے جنگیں لڑنا پڑتی ہیں) اور پھر سرزمین عرب میں اسلام کو نافذ کر دیا یعنی جو لوگ اس علاقہ میں رہیں گے انہیں قرآن کے احکامات پر عمل کرنا ہوگا ان کے ماتحت زندگی گزارنی ہوگی جس کو یہ پسند نہیں اسے چار ماہ کی مہلت ہے وہ یہاں سے چلا جائے لیکن جو اس اسلامی مملکت کی حدود میں رہنا چاہے گا خواہ وہ کافر ہی ہو اُسے بھی اجتماعی معاملات میں اسلام کے احکام کے تابع رہنا ہوگا مثلاً چوری ڈاکہ وغیرہ کی سزا اور شرعی حدود کے تابع رہنا ہوگا ورنہ یہاں نہیں رہ سکتا۔

رسول اللہ ﷺ کی بات کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی سمجھا لیکن ہم اکثر یہ سمجھتے ہے کہ ہمارا دین بس ذاتی عبادات کا نام ہے آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کا مطالعہ کریں تو کسی صحابی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بھی ایسا موجود نہیں ہے کہ کسی صحابی رضی اللہ عنہ نے یہ کہا ہو کہ یا رسول اللہ ہم تو آپ کے پاس آئے تھے تاکہ نماز سیکھیں ذکر واذکار سیکھیں آپ نے ہمیں تلوار پکڑا دی کہ چلو بدر میں یا احد میں یا صلح حدیبیہ میں یا فتح مکہ کے لئے چلتے ہیں کسی ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی ایسی روایت نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس کچھ لوگوں کے بارے میں قرآن میں ذکر ہے کہ جو کہتے تھے۔ کہ اللہ ﷻ کے

راستہ میں کیوں نکلا جائے ویسے وہ جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو کہتے تھے کہ اے اللہ ﷻ کے رسول ہمارے دل میں آپ کی محبت اور قدر بہت زیاد ہے لیکن ہم آپ کو دل چیر کر نہیں دکھا سکتے ،لیکن کچھ مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے جب آپ جہاد میں جانے کا تقاضا کرتے ہیں ہم جانہیں سکتے' ایسے لوگوں کو قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ 'منافق' ہیں سورۃ منافقون کی پہلی آیت اسی بارے میں ہے کہ (اِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُوْنَ قَالُوْانَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُه' وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ)''اللہ جانتا ہے کہ آپ اللہ ﷻ کے رسول ہیں لیکن یہ لوگ جو قسم کھا کر گئے ہیں کہ ہمارے دل میں آپ کی بڑی محبت ہے اللہ ﷻ بھی قسم کھا کر کہہ رہا ہے کہ یہ منافق جھوٹ بول کر گئے ہیں'' اللہ ﷻ کے رسول کی بات نہ ماننا اہل ایمان کے لئے کیسے ممکن ہوسکتا ہے ۔ پہلے بھی یہ بات ہوچکی ہے کہ اللہ ﷻ جو ہمارا رب ہے اس کی اطاعت کرنا ،اس احکام پر عمل کرنا وہ جو چاہے ہمیں حکم دے سکتا ہے کہ ایسے کھانا پینا ہوگا اور ایسے معاملات ہوں گے اور ایسے شادی بیاہ اور کاروبار ہوگا اور ہمیں وہ OBSERVE کرنا ہوگا ۔ اللہ ﷻ کے رسول ﷺ یہی کہتے رہے اور صحابہ ؓ اس پر عمل کرتے رہے اور جس نے عمل نہیں کیا وہ منافق ہے جو شخص قرآن کے احکام پر عمل نہیں کرتا محمد ﷺ کی بات نہیں مانتا اس کے دل میں محمد ﷺ کی محبت نہیں ہوسکتی ۔ اجتماعی زندگی سیاسی ، معاشی ، معاشرتی ، سماجی معاملات ان سب کے متعلق قرآن میں ہدایت موجود ہے کوشش کر کے کتابوں ،کیسٹوں آڈیو ،وڈیوسی ڈیز کے ذریعہ معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں ۔ انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کے متعلق قرآن میں احکام موجود ہیں ہمیں ان پر عمل کرنا ہوگا قرآن کی ہدایت یہ ہے کہ پہلے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تقسیم کو ذہن سے نکالو اب ہم نے یہ تقسیم سمجھنے کے لئے کی تھی اور اگر کسی کو انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کے لفظ سے بات سمجھ نہ آئے تو عام بول چال میں اسے کہتے ہیں ''دینی اور دنیاوی زندگی'' ہم دیکھتے ہیں کہ جو عبادات میں سے نماز اور نوافل اشراق ،تہجد وغیرہ کا پابند ہو اور ہاتھ میں تسبیح لے کر سیر کرتا ہو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ آدمی بڑا دیندار ہے اور کاروبار ،معاملات اور شادی بیاہ یا سیاست میں حصہ لے کر دین نافذ کرنے کی بات کرنا ہم کہتے ہیں کہ یہ دنیاداری کے کام ہیں یہ تقسیم ہم نے خود کر رکھی ہے قرآن کہتا ہے کہ یہ تقسیم ختم کرو ساری زندگی ایک زندگی ہے یعنی

انفرادی زندگی اجتماعی زندگی بس! دینی دنیاوی تصور ختم ہوجانا چاہئے اور پوری زندگی ایک حقیقت ہے اس پوری زندگی کے ہر شعبہ میں ہر WALK OF LIFE میں قرآن کے مطابق اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے مطابق یا بالفاظ دیگر ہمارے رب نے جو میسج (پیغام) ہمارے لئے بھیجا ہے اس کے مطابق زندگی گزارو۔

حضرات یہ قرآن مجید ہمارا ہے اور اللہ ﷻ نے ہماری ہدایت کے لئے راستے اپنے خاص پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو دے کر بھیجا تھا وہ اپنا مشن پورا کر کے کامیاب ہو کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ جن حضرات نے براہ راست ان سے سنا تھا انہوں نے بھی حق ادا کر دیا قرآن نے انہیں کامیاب قرار دیے دیا اور ان کو ﷺ کا خطاب دیا وہ بھی دنیا سے تشریف لے گئے اس کے بعد بھی جو لوگ اسی طرح سمجھ کر عمل کرتے رہے وہ بھی درجہ بدرجہ کامیاب ہو گئے۔ آج دنیا کے سٹیج پر ہم ہیں ہمارا یہ امتحان ہے کہ ہم کیا کرتے ہیں ہم جب تک زندہ ہیں کمرۂ امتحان میں ہیں موت کیساتھ ہی امتحان کا وقت ختم ہوجائے گا پرچہ ہم سے چھین لیا جائے گا پھر دنیا میں اور لوگ آجائیں گے ہمیں اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہئے کہ ہم اللہ ﷻ کے اس پیغام 'الہدیٰ' کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا حُبَّكَ وَحُبَّ حَبِیْبِكَ ﷺ (آمین)